گناہ گار

از

عفت موہانی

قیمت

اٹھارہ روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ٹیلیفون: ۴۴۵۵۹، ۴۵۳۳۴

ناشر:- فہیم انہونوی (بار اول جون سنہ ۱۹۸۳ء) پرنٹر: نظامی پریس۔ لکھنؤ

نثار احمد کے نام
بے حد شفقت و محبّت کے ساتھ
عِفّت موہانی

امّی کی آواز پھر سنائی دی۔ نجانے بار بار وہ اسے کیوں پکارے جا رہی تھیں۔ عاتیبہ نے مڑ کر باپ کو دیکھا۔ وہ سو چکے تھے۔ ان کی خواب گاہ سے امی کو جواب دینا مناسب نہیں تھا۔ ابا جان دیر تک تکلیف جھیل کر سوئے تھے۔ لہٰذا بڑے چپکے سے عاتیبہ نے ان کی کمر تک گرم شال اڑھائی۔ اور آہستہ سے پردہ برابر کر کے باہر نکلی۔

خزاں کا ایک زرد و اداس دن ڈھل رہا تھا۔ صحن کی اونچی دیوار پر اترتی ہوئی دھوپ کپکپا رہی تھی۔ پختہ فرش پر جوہی کی گھنی بیل کے سائے دلچسپ نقشے بنا رہے تھے۔ عاتیبہ کو ایسے موسم ہمیشہ اداس اور پریشان کر دیتے۔ موسموں کا تغیر اس کے مزاج پر بھی اثر انداز ہوتا تھا۔ خاص کر خزاں اسے کبھی اچھی نہ لگی۔ اور پھر یہ خزاں تو عجیب عجیب فکریں اور پریشانیاں اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ جیسے اس کے گھر کی خوش حالی پر بھی پالا مار گیا تھا۔

باورچی خانے کی دہلیز پر اس کا سایہ دیکھ کر امی نے سر اٹھایا

"کیا کر رہے ہیں تمہارے ابا؟" انہوں نے پوچھا۔

"بڑی تکلیف تھی بازو میں۔ میں دیر تک دباتی رہی اب کہیں سوئے ہیں۔"
امی نے بے اطمینانی کی سانس لی۔ "ڈاکٹر صاحب نے شام کو چار بجے بلایا

تھا۔ تم جاؤ گی ان کی کیفیت لے کر۔ یا میں چلی جاؤں۔؟"

"آپ جیسا کہیں۔ امی۔!" عافیہ نے جواب دیا۔ اور کوشش کرنے لگی کہ اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کی سرخی امی نہ دیکھیں۔ ویسے بھی انھیں اتنا ہوش کہاں تھا۔!

میرے دماغ کی یہ حالت ہے بیٹی کہ مجھے راستے ہی یاد نہیں رہتے۔" امی نے کہا اور اٹھتی ہوئی بولیں۔ " اور کوئی ساتھ جانے والا ہے نہیں۔ تم اگر جاکے باپ کی کیفیت ڈاکٹر صاحب سے کہہ کے دوا لے آؤ تو اچھا ہے۔ اپنے ساتھ حمزہ کو لے لینا اور بی بی جلدی چلی بھی آنا۔!"

امی کا اضطراب اس سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ خود بھی کچھ کم ہراساں نہ تھی۔ اپنے اور گھر بھر کے مستقبل کا سوال بھیانک اژدہے کی طرح منھ پھاڑے ہوئے تھا۔ کریمی صاحب کی ناگہانی بیماری نے گھر کو ایک قلابازی سی کھلا دی تھی۔ اور اب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بدحالی کی اس دور پر ان کی گرفت کب تک جمی رہے گی۔؟

وہ انگلش جونیر کالج کے پرنسپل تھے۔ اور اپنی معقول آمدنی میں بڑے سکون و اطمینان سے گزر بسر کر رہے تھے! بیوی سلیقہ شعار تھیں۔ صرف ۲ دو بچے تھے۔ عافیہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھی۔ اور اس سے چھوٹا حمزہ انٹرنس میں تھا۔ کریمی صاحب کی دیرینہ آرزو تھی۔ ان کا ایک چھوٹا سا اپنا گھر ہوتا۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے انہوں نے زمین خرید کے مکان بنوانا شروع کر دیا تھا۔ یکمشت اتنی رقم تھی نہیں۔ جو بنا بنایا ہوا مکان خرید سکتے۔ تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرتے اور مکان کا ایک آدھ کمرہ بنوا دیتے۔ انہوں نے بیوی کا اور بچی

کے زیور فروخت کر کے زمین خرید لی تھی۔ پوری توقع تھی کہ سال ڈیڑھ سال میں وہ ایک منزل تو بنا ہی لیں گے۔ کرائے کا مکان چھوڑ دینے کے بعد بھی یہی سمجھا کریں گے کہ کرائے کے گھر میں ہیں۔ اور جو کرایہ بچے گا اس سے دوسری منزل بھی تعمیر ہو جائے گی۔ لیکن ان کی ساری آرزوئیں دفعتہً منہ کے بل آ رہیں۔

ایک رات وہ کالج کا کوئی جلسہ اٹنڈ کر کے واپس ہو رہے تھے کہ اچانک ان کے بائیں حصہ جسم پر سردی کا اثر ہو گیا۔ وہ زمین پر گر پڑے۔ ان کے طالب علم انہیں اٹھا کر گھر پہونچا گئے۔ اور اب مسلسل ایک مہینے سے وہ عضو معطل بنے بستر پر پڑے تھے۔ بہت برا وقت آ گیا تھا۔ اب تنخواہ کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گھر میں جمع پونجی کچھ بھی نہیں۔ سونے چاندی کے نام پر ایک تار بھی نہ تھا۔ مزید ستم یہ سنگین بیماری اور مرے پر سو درّے جاں سوز گرانی ـــــ ان کی حالت روز بروز ردّی ہوتی گئی۔ ان کا جسم بے کار تھا مگر ذہن تو صحت مند تھا۔ سوچتے سوچتے وہ زیادہ بیمار ہو رہے تھے۔ بیوی کی فکر مند شکل، بیٹی کا پریشان چہرہ، حمزہ کی اداسی۔ باری باری سب چہرے ان کی نظروں تلے پھرتے۔ اور ان پر غشی سی طاری ہو جاتی۔ اپنے ساتھ ساتھ وہ سب کی موت کی دعائیں مانگا کرتے! لیکن موت بھی ان سے خفا تھی۔! نہ آئی۔ زندگی البتہ موت سے بدتر ہو گئی۔ ہر وقت ان کے بسپڑی بندھے ہونٹوں پر بس یہی رہتا۔

"اے اللہ رحم۔ اے اللہ رحم۔"

لیکن اللہ ان کی نیکیوں اور صبر کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ وہ رحم رحم چلاتے رہے ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ساری ساری

رات بازو اور کمر کے درد سے بے چین رہا کرتے۔ خود جاگتے سب کو جگاتے۔

ان کے ایک پرانے کلاس فیلو دوست کے بیٹے ڈاکٹر دانش کا علاج ہو رہا تھا۔ ہنوز افاقہ کی صورت نہ تھی۔ ڈاکٹر دانش مروّت کے مارے بل نہیں دیتے تھے۔ لیکن کریمی صاحب کی بیوی تو جانتی تھیں کہ بل کی صورت میں ایک نیا قرض سر پر سوار ہو رہا تھا۔ وہ مارے بوکھلاہٹ اور پریشانی کے اپنے آپے میں نہ تھیں۔ کیا ہوگا اگر ڈاکٹر دانش یکمشت سیکڑوں کا بل بھیج دیں گے۔ صبح و شام ان کے لبوں پر بھی یہی وظیفہ تھا:

"پروردگار! اب رحم فرما۔"

چار بجتے بجتے عافیہ نے لباس تبدیل کیا۔ حمزہ کسی دوست کے پاس اسٹڈی کرنے جا چکا تھا۔ وہ اپنے جان پہچان کے رکشہ پر اکیلی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف چل دی۔

بارہا وہ انہی راستوں سے گزری تھی۔ اور کبھی سڑک کی چہل پہل کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اب وہ کتنی حسرت سے اُن بے فکر راہگیروں کو دیکھ رہی تھی جو شام کی تفریح کی خاطر سڑک پر ہنستے بولتے قہقہے لگاتے چلے جا رہے تھے ایک ہوک سی اس کے دل سے نکلی۔! اور وہ سر جھکا کر نجانے کیا سوچنے لگی۔!

شام کے وقت کلینک میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ لڑکے نے اس کی آمد کی اطلاع اندر پہنچائی اور دوسرے لمحے اسے بلا لے گیا۔! ڈاکٹر صاحب کے سامنے کرسی پر ایک بھاری بھرکم معمّر آدمی بیٹھا تھا۔ قیمتی لباس میں ملبوس۔ موٹی موٹی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں جن میں

سچے نگینے جڑے تھے! بڑا بھاری کلہ ٹھلہ بارعب چہرہ۔ عافیہ کو اندر آتے دیکھ کر انہوں نے مصافحہ کے لیے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور اپنی گونج دار آواز میں بولے:

"جناب! خیال رکھیے گا۔ میں رات کو آپ کا منتظر رہوں گا۔ ان کی طبیعت ایسی ہی خراب ہے۔ ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ گاڑی بھجوا دوں؟۔"

"جی نہیں۔ شکریہ۔ میں آجاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

وہ صاحب اٹھ گئے۔ اور ایک گہری نظر عافیہ پر ڈال کر باہر نکل گئے۔! ڈاکٹر دانش عافیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اشارے سے کرسی کی طرف دیکھا۔

مگر عافیہ دور پڑے اسٹول پر ٹک گئی۔!

"کیسے ہیں چچا صاحب؟"

جواب میں عافیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔!

"اوہو۔" ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔ "اگر کوئی بات تشویش ناک ہو تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔؟ .... میں نے جو دوا دی تھی۔ اس سے درد کچھ کم ہوا کہ ـــ؟۔"

"جی نہیں۔" عافیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ درد اب اباجان کو زیادہ تباہ کر دے گا۔ وہ تو کروٹ تک نہیں لے سکتے۔!"

"پریشان مت ہو۔ عافیہ۔ میں اپنی ہر بہترین کوشش کر رہا ہوں اس مرض میں دیر ضرور لگتی ہے۔ لیکن بالآخر دور ہو ہی جاتا ہے۔ میں دوسری

دوا دیتا ہوں۔ اس کے استعمال سے ضرور فائدہ ہوگا!۔"

"مجھے امید نہیں۔!"

"اتنی زیادہ بدہمت کیوں ہوگئی ہو۔؟"

"یہ آپ کے پوچھنے کی بات نہیں ہے۔!"

"کیوں؟"

"ہمارے حالات کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہیں!"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن اس طرح جی چھوڑ دینے اور ہمت ہارنے سے کیا حالات بہتر ہوجائیں گے؟!"

"پھر بتائیے۔ میں کیا کروں؟"

"عزم و ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔!" وہ خفیف سا مسکرائے "تم خود کو تنہا کیوں سمجھتی ہو؟ مجھ پر بالکل اعتبار نہیں ہے؟۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر دانش نے اپنی میز کی دراز سے چند دوائیں نکالیں اور عافیہ کی طرف بڑھا دیں۔

"انہیں پابندی سے کھلانا۔"

"ابا جان کبھی چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو سکیں گے کہ نہیں؟"

"ضرور ہوں گے۔ لیکن پہلے کی طرح نہیں۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ خوش رنگ امید کبھی بڑی بھیانک ناامیدی میں بدل جاتی ہے۔ لہذا تم اپنا دل مضبوط کرو۔ چچا صاحب ضرور اچھے ہوجائیں گے۔ کسی سہارے کے ساتھ چل پھر بھی سکیں گے۔ لیکن پہلے کی طرح نہیں!"

وہ چپ رہی۔ اور ڈاکٹر دانش عافیہ کو دیکھتے رہے۔ حسن آخر حسن ہے۔ پژمردہ اداس ہو تو زیادہ دلفریب اور پُرکشش ہو جاتا ہے۔ یہ چہرہ جو کاسنی ڈوپٹے کے ہالے میں محصور ہے۔ کیا اس چاند کی مانند نہیں جس پر بادل کی ردا منڈھ گئی ہو۔

"عافیہ!"

"جی!" اس نے پلکیں اُٹھائیں۔

"میں تمہارا دکھ جانتا ہوں۔ میری التجا ہے کہ تم خود کو اکیلی اور اداس مت سمجھو۔ مجھے ہر وقت تمہارا خیال ستاتا رہتا ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ ہم تم بہت پرانے ساتھی ہیں نا۔ تم میرے آنگن میں شبنم کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ اور تمہارے یہاں آکر چچی اماں کے ہاتھ کی بنی کھجوریاں کھاتا تھا۔! وہ زمانے وہ دن۔ میں نہیں بھولا۔ تم بھی نہ بھولی ہو گی۔! مجھے یقین ہے عافیہ۔! یہ عبوری روز و شب ضرور گزر جائیں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر ہم دونوں ——

—— " دفعتہً لڑکا اندر آیا۔

"صاحب آپ کا فون۔"

"اچھا۔ میں ابھی آیا۔"

"میں چلوں؟" عافیہ نے پوچھا

وہ اُٹھ گئے۔ "ہاں۔ ویسے دل نہیں چاہتا۔ لیکن —!"

"آپ کو اگر فرصت ہو تو ابا جان کو دیکھ جائیے گا۔"

"ضرور ضرور۔ رات کو میں جا رہا ہوں۔ بیرسٹر صاحب کی بیگم کو دیکھنے

تم نے ابھی انہیں یہاں بیٹھے دیکھا تھا۔؟"

"جی ہاں۔!"

"واپسی پر تمہارے یہاں ہوتا ہوا جاؤں گا۔"

"صاحب۔ آپ کا ٹیلی فون۔!" گھنٹی کی آواز سن کر لڑکے نے پھر کہا۔

"خدا حافظ۔!" ڈاکٹر نے کہا۔ اور پھر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

عافیہ بھی باہر نکل آئی۔

ڈاکٹر کی دل خوش کن تسلیوں نے اتنا کام تو کیا تھا کہ جب عافیہ واپس آرہی تھی تب اس کا معصوم دل امیدوں سے پُر تھا۔ وہ نجانے کن خیالوں میں گم تھی۔ کبھی وہ اس زمانے میں پہنچ جاتی۔ جہاں ان کا بچپن بے معنی کھیلوں میں گزرا تھا، کبھی خیال اسے معنی و مفہوم سے عاری شباب کی اولین ساعتوں میں کھینچ لے جاتے۔ جہاں خواہ مخواہ ایکدوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھنے ہی سے گال جلنے لگتے تھے۔ اس نے بڑا طویل عرصہ دانش کے ساتھ گزارا تھا۔ دانش اسکول اور کالج سے واپسی پر اپنے وقت کا بڑا حصہ اسی کے گھر میں بسر کرتے تھے۔ عافیہ کی امی انہیں بہت چاہتی تھیں۔ شروع ہی سے دانش کی عادتیں پسندیدہ تھیں وہ عام نوجوانوں کی طرح بیباک خواہ مخواہ قہقہے لگانے اور بے تکی باتیں کرکے اپنی بےجا انفرادیت کا سکّہ منوانے کو بہت برا خیال کرتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے شریفانہ باتیں کرتے۔ اگر کبھی تنہائی میں انھیں عافیہ سے گفتگو کا موقع ملتا تو بھی وہ واہیات انداز میں یہ ظاہر نہ کرتے کہ

انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا تھا۔ ان کی پسندیدہ عادتیں آہستہ آہستہ عافیہ کے دل میں گھر کر گئیں۔ جس طرح ایک درخت کی جڑ زمین کے اندر دور تک پہنچ کر اپنا مضبوط مقام بنا لیتی ہیں۔ دانش کی گونگی محبت بھی عافیہ کے دل کی زمین میں نجانے کہاں تک اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔ اس نے بھی کبھی اپنی گفتگو یا نقل و حرکت سے ظاہر نہیں کیا۔ وہ دانش کو اپنا سب کچھ مان چکی ہے۔ لیکن محبت ہمیشہ آنکھوں سے باتیں کرتی ہے۔ ان کی آنکھوں نے بھی بہت سی باتیں کی تھیں اور خود بخود سمجھنے لگے تھے۔ زمانہ اور حالات چاہے کتنے ہی بدل جائیں۔ ان کی محبت کی چٹان میں کبھی کوئی دراڑ نہیں پڑے گی۔!

وہ اپنی اپنی تقدیروں کو بھول گئے تھے۔ تقدیر۔ جو ہمیشہ محبت کرنے والوں کا راستہ کاٹتی ہے۔ جسے محبت بھرے دلوں سے ازلی دشمنی ہے۔!

اور پھر دل کو بہلانے کا بھی تو کوئی سامان ہونا چاہیئے۔ مصیبتوں کے دور میں موہوم امیدیں ہی روشنی کا مینار بن جاتی ہیں۔

بیرسٹر عباد علی خاں کا شمار شہر کے نامی گرامی وکلا میں ہوتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ معاوضہ زبردست لیتے تھے لیکن بڑے سے بڑے مقدمہ کو بالآخر پانی کر کے رکھ دیتے تھے۔ قاتل کو روپے

کے زور پر بری کرانے اور بے گناہ کو عمر قید کی سزا دلوانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے کثیر سرمائے سے انہوں نے مختلف فائدہ مند کاروبار بھی شروع کر دیئے تھے۔ ایک آئرن فیکٹری میں ان کا معقول روپیہ لگا ہوا تھا۔ شہر میں کئی ایک ٹیکسیاں چلتی تھیں۔ ایک بڑا ہوٹل تھا شہر کے متمول ایریئے میں ان کی شاندار خوب صورت کوٹھی تھی۔ جو اس قدر پر کشش اور تمول کا منہ بولتا اشتہار تھی کہ ہر راہ گیر آتے جاتے اس پر ایک رشک بھری نظر ضرور ڈال لیتا تھا۔ وسیع کمپاؤنڈ میں جہاں دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے اور جنھوں نے سنگ مرمر کی وسیع و عریض روش پر سایہ کر رکھا تھا۔ بہ یک وقت دو دو گاڑیاں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں! ایک گاڑی جو نسبتہً چھوٹی مگر خوشنما تھی وہ بیرسٹر صاحب کے استعمال میں رہتی۔ دوسری افراد خاندان کے لیے تھی۔ یہ سفید گاڑی بہت خوب صورت تھی۔ اکثر اسے بیرسٹر صاحب کی اکلوتی صاحبزادی فاخرہ سڑکوں پر دوڑاتی نظر آتی تھیں۔

ہر طرح کی فارغ البالی کے باوجود بیرسٹر صاحب کے دل پر ایک داغ ضرور تھا۔ وہ ہمیشہ کڑھا کرتے تھے۔ خدا نے انہیں ایک سعادت مند لڑکے سے محروم کر رکھا تھا۔ اپنی دیرینہ آرزو کی بجائی کے لیے انہوں نے دوا اور دعا کا کوئی خانہ خالی نہ چھوڑا۔ لیکن امید بر نہ آئی۔ ان کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ اس دین کے بعد قدرت نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اکثر بڑی حسرت سے سوچتے کہ ہمسائے کے معمولی سے ڈرائیور کو خدا نے یکبارگی پانچ پانچ بیٹے دے رکھے تھے۔ جب کبھی ڈرائیور غلام حسین

بیرسٹر صاحب سے ملتے تو رونا روتے کہ کاش ان کے ایک بیٹی بھی ہوتی!
بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ ماں باپ کے جنازوں پر پچھاڑیں کھانے
اور سچے دل سے آنسو بہانے والی۔ انہوں نے صرف اپنے کندھا بردار پیدا
کر دیئے۔ رونے والی ایک پیدا نہ کی۔ اور تب بیرسٹر صاحب حسرت سے ان
کا منہ تکا کرتے۔ کیا خدا کی شان ہے۔ وہ بیٹی کے لیے تڑپ رہے ہیں اور
یہ بیٹے کے لیے مچل رہے ہیں۔! خیر بھئی۔ نہ ہوا ان کے یہاں بیٹی۔ کون سا
ان کے یہاں خزانہ دبا ہے۔ باپ بس ڈرائیور ہے۔ لڑکے بھی معمولی حیثیت
ہی اختیار کر لیں گے۔ لیکن یہاں تو یہ مصیبت ہے کہ دولت کا کوئی شمار
نہیں۔ ان کے بعد بس قانونی طور پر فاخرہ کو کچھ حصہ مل جائے گا۔ باقی
سرمایہ کدھر جائے گا۔ کاش کوئی وارث پیدا ہو جاتا۔!

لیکن اب تو کوئی موہوم سی آس بھی نہ رہی تھی۔ کیوں کہ چھ مہینے
سے بیرسٹر صاحب کی بیگم مسلسل بیمار چلی آرہی تھیں۔ ڈاکٹروں کی
تشخیص تھی کہ ان کا دل بڑھ گیا تھا۔ ان پر بڑی سرعت سے مٹاپا آیا
تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم نے پھولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔! اندیشہ تھا
کہ وہ اچانک کسی وقت بھی مر سکتی تھیں۔!

بیرسٹر صاحب کا حال عجیب تھا۔ ایک طرف تو وہ غالباً خود کو اور
بیوی کو دھوکا دینے اور دنیا کو دکھانے کے لیے دوا علاج پر پانی طرح
پیسہ بہا رہے تھے اور دوسری طرف دل کی گہرائیوں سے یہ بھی چاہتے
تھے۔ کہ جلد از جلد بیگم کا پاپ کٹے۔! ان کی عمر بے شک مرنے کی تھی۔ مگر
بیرسٹر صاحب تو ابھی جوان تھے۔ بھلا پچاس پچپن بھی کوئی عمر ہوئی۔ ان

کی دولت پر کئی بھو کی چیلیں گر سکتی تھیں۔ کیا ان میں سے کوئی بھی ایک لڑکا پیدا نہیں کر سکتی ۔۔ ؟

روز شام کو وہ تفریحاً جاگیر دار کلب جایا کرتے تھے۔ وہاں کی ایک ممبر پر ان کی ڈھکی چھپی نظر عنایت بھی تھی ۔!

انتظار بس یہ تھا کہ بیگم ہمیشہ کے لیے گھر سے رخصت ہوں تو اُس زندہ بجلی سے بات چیت کی جائے۔ جو بس ان کی طرف مسکرا کر دیکھنے پر اکتفا کرتی تھی ۔! بیرسٹر صاحب کو یقین تھا۔ وہ مچھلی اپنی ہی مسکراہٹ کی جال میں پھنسے گی ۔!

رات کا وقت تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ جبراً و قہراً بیوی کے پاس آبیٹھے تھے ۔! وہ بستر پر پڑی کراہ رہی تھیں۔ بیرسٹر صاحب دل ہی دل میں آگ بگولہ ہو گئے۔ نجانے یہ کراہیں کب بند ہوں گی۔ سنتے سنتے جی متلا گیا ہے ۔!

پھر بھی بے حد محبت اور دل سوزی سے پوچھا:

"کیا خدا نخواستہ کچھ زیادہ تکلیف ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ فاخرہ کبھی تمہارے پاس نہیں بیٹھتی۔ آخر اس کے کیا مشاغل ہیں؟ تم نے بستر پکڑا ہے۔ میں باہر مصروف رہتا ہوں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم وہ دن بھر اور رات گئے تک باہر رہتی ہے تو کیا کیا کرتی ہے ؟ ۔۔ تم نے کبھی اس سے دریافت کیا ؟۔ "

بیگم نے بیزاری سے جواب دیا۔ "آپ نے اپنے دُلار میں اسے یہ تربیت ہی نہیں دی کہ وہ ماں کو بھی کچھ سمجھتی۔ جہاں جی چاہتا ہے

جاتی ہے جو دل چاہتا ہے کرتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہاں جاتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ یہ لچھن بالکل اچھے نہیں۔۔!"

"میں اسے منع کر دوں گا۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "لیکن وہ بھی کیا کرے۔ پڑھائی ختم کر چکی۔ دوسرا مشغلہ ہے نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی اچھا لڑکا ملے تو بس اس کی شادی کر دی جائے۔!"

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس چیز کے انتظار میں بیٹھے ہیں"۔ بیوی نے جواب دیا۔ "اچھا لڑکا کیا خود ہی آپ کے دروازے پر دستک دے گا۔ ارے میں کہتی ہوں۔ ہزاروں آپ کے دوست ہیں۔ درجنوں موکل ہیں۔ کیا ان میں ان کی اولاد میں کوئی ایسا نہیں جو آپ کا داماد بن سکے؟"

"بہتیرے ہیں۔" بیرسٹر صاحب الجھن میں پڑے تھے۔ خواہ مخواہ کتنی بھدّی باتیں چھڑ گئیں انھیں فی الحال فاخرہ کی شادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بے زار لہجے میں بولے۔ "لڑکے ہیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس حد تک اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ دیکھنا ضروری نہیں ہے کہ کہاں تک اچھا داماد بن سکتا ہے۔ اور ـــ!"

"عجیب طرح کی منطق ہے آپ کی۔ ہر بات میں بحث۔ الٹی جرح۔ بال کی کھال ـــ!"

"بات کو سمجھا کرو۔" بیرسٹر صاحب بولے۔ "ہم خدا کے فضل سے کوئی گری پڑی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہماری پوزیشن سبھی پر خوب واضح ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ وارث بس وہی ایک لڑکی ہے۔ بھئی مفت کی دولت کے خیال سے کس کی رال نہیں ٹپکتی۔ اب کوئی لالچی حریص لڑکا فاخرہ کا شوہر

بن گیا تو تم جانو کہ میری ساری دولت جو میں نے خون پسینہ ایک کر کے جوڑی ہے۔ وہ فاخرہ کے توسط سے غیر شخص کو مل جائے گی نا۔ میں ایسے لڑکے کی تلاش میں ہوں۔ جو لالچی اور خود غرض نہ ہو۔ اور ایسا لڑکا آسانی سے نہیں مل رہا۔ سمجھیں۔؟"

"ایسا لڑکا مل بھی جائے تو کون اس کے پیٹ میں اتر کے دیکھے گا کہ اندر سے کیسا ہے۔ اندیشے ہی اندیشوں میں آپ فاخرہ کو بوڑھی کر دیں گے میں تو ڈرتی ہوں کہ کہیں۔ اس نے خود ہی کسی کا ہاتھ تھام لیا تو پھر رہ جائے گی آپ کی وکالت اور بحث۔ آزاد اور خود سر تو وہ ہے ہی۔۔۔!"

بیرسٹر صاحب کچھ بوکھلا گئے۔ اس طرف ان کا خیال ابھی تک نہیں گیا تھا۔ کہ فاخرہ خود بھی اپنا ساتھی منتخب کر سکتی تھی۔ وہ کسی سوچ میں گم ہو گئے کیا تدارک کیا جائے۔؟

ملازم نے ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر سنائی۔!

"لے آؤ یہیں۔" اکتائے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا۔

ملازم ڈاکٹر دانش کو لے آیا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ دانش صاحب۔ آپ نے اپنا آرام خراب کر کے تکلیف کی۔ آئیے۔ تشریف رکھیے۔" بیرسٹر صاحب نے کہا اور انھیں دفعتہً کچھ یاد آگیا۔ کیا بات تھی اس ڈاکٹر میں کہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی انہیں وہ لڑکی یاد آگئی جو ان کے کلینک میں آئی تھی۔

بیٹھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کرسی کھسکائی اور بیگم صاحبہ کی کیفیت پوچھنے لگے! بیرسٹر صاحب کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے یہ دریافت کریں

بھائی کوئی ایسی تدبیر نہیں۔ جس سے مجھے جلد چھٹکارہ ملے۔ لیکن چونکہ ان کی بہت سی زندگی بے ساختہ منافقت میں گزری تھی لہٰذا اب بھی وہ بڑی فکر مندانہ دلجمعی سے معالج اور مریض کی گفتگو سننے لگے۔

پھر ڈاکٹر صاحب اٹھے اور بیگم صاحبہ کو اطمینان دلا کر باہر آ گئے ان کے پیچھے بیرسٹر صاحب بھی نکلے۔

"کیوں جناب! کیا بات ہے۔ آپ بہت خاموش ہیں؟" بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔

"اب میں آپ سے کیا عرض کروں قبلہ۔" ڈاکٹر دانش نے جواب دیا "میں نہیں چاہتا کہ آپ کو پریشان کروں۔ مگر ــــ!"

"مگر ــ؟ ــ" بیرسٹر صاحب کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔

"وہ۔ کچھ۔ مطلب یہ کہ ــ مرض جب اس قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے تو پھر معالج بھی ہر طرف سے مجبور ہو جاتا ہے جناب۔!" ڈاکٹر صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرا شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ نہ میں خود کو دھوکہ میں رکھتا ہوں نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ مریض سے جو لوگ متعلق ہیں وہ دھوکہ میں مبتلا رہیں۔ محترمہ بیگم صاحبہ کا مرض۔ معاف کیجئے گا۔ بالکل آخری مرحلہ پر ہے۔ اس لئے جہاں تک آپ سے عرض کرنے کا سوال ہے وہ یہ کہ ــ اب کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے۔"

"آپ نے تو سینے سے دل ہی نکال لیا جناب!"

"میں یوں بھی نو آموز ہوں قبلہ۔ آپ اپنے اطمینان کے لیے کسی کہنہ مشق فزیشین سے بھی رجوع کر دیکھئے۔ شاید ــ!"

دل میں بیرسٹر صاحب نے کہا۔ کہنہ مشق معالج سے کون مسخرہ رجوع کرے گا۔ تم نے تو سوکھے دھانوں میں پانی ڈال دیا ہے۔ میاں بڑی خوش خبری سنا دی۔ مگر بے حد فکرمند اور روہانسے نظر آنے لگے۔

"آپ انھیں سول ہسپتال میں کچھ دنوں کے لیے شریک کرا دیجئے" دانش نے کہا۔ "وہاں ایک ڈاکٹر صاحب مسٹر تیواری میرے دوست بھی ہیں اور امراض قلب کے ماہر بھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں بیگم صاحبہ کا خاطر خواہ علاج ہو سکے۔ گھر پر ویسے بھی مناسب طبی مدد فراہم نہیں کی جا سکتی۔"

"ہاں۔ ہاں، ضرور۔!"

اپنی فیس صحیح کر کے ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو بیرسٹر صاحب نے کہا "اچھا وہ دیکھیے۔ خوب یاد آیا۔ آپ کے کلینک میں جو لڑکی میں نے دیکھی تھی۔ کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ کون تھی ۔۔؟"

"ناصر کریمی صاحب کی صاجزادی ۔!" خشک لہجے میں دانش نے کہا۔

"کیا، واقعی؟" بے ساختہ حیرت سے بیرسٹر صاحب نے کہا دانش انہیں ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے رہے۔

"وہی تو میں کہہ رہا تھا!" بیرسٹر صاحب بولے "اب یہ معمّہ حل ہوا۔ ناصر کی لڑکی ہے۔ خوب۔ ارے یہ ناصر مدتوں سے غائب کہاں تھے؟ میں تو اکثر ان کی یاد میں بے چین رہا ہوں۔ ہم دونوں کبھی کلاس فیلو تھے۔ اب کہاں رہتے ہیں وہ؟ میں ان سے ملوں گا۔!"

پتہ بتاتے ہوئے دانش نے کریمی صاحب کی بیماری کے متعلق بھی ضروری باتیں کہہ دیں۔ ان کی بیماری کا حال سن کر بیرسٹر صاحب پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ چہرہ اتر گیا۔ آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔

"غیرت دار اتنا ہے کہ۔ ممکن ہی نہیں۔ میری کوئی مدد قبول کرے" وہ بولے۔ "بہر حال ملتا تو ہوں۔ شاید میں اس کے کچھ کام آسکوں۔ آخر میرا سرمایہ ہے کس مصرف کا۔! آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔ میاں۔ آپ نے ــــ!"

"جی ہاں۔" بات کاٹ کر دانش نے کہا۔" آپ ان سے ضرور ملیے ان حالات میں انہیں ایک ہم عمر ساتھی کی ضرورت بھی ہے!"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھ گئے اور اپنے ذہن میں برپا طوفان پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دل اور دماغ کی جنگ میں بے چارے نیم مردہ ضمیر کی گنگناہٹ ــــ بالآخر انہوں نے اپنے معمّر دماغ کو للکار دیا اور نوعمر دل کی رہبری قبول کرلی۔ بیوی کی طرف سے اطمینان تھا۔ یہ بھی خدا کا احسان تھا کہ فاخرہ یا پھر کسی ملازم نے ڈاکٹر کی ہدایت نہیں سنی تھی۔ ورنہ وہ شاید بیگم صاحبہ کے ہسپتال کے داخلے پر زور دیتا۔!

پھر وہ اٹھ کر اندر گئے مگر بیوی کے کمرے میں جھانکا تک نہیں۔ کیا جھانکتے۔ کراہیں تو کمرے کے باہر بھی گونج ہی رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ملازم کو نسخہ دے کر بازار بھجوا دیا اور خود اپنے کمرے میں آگئے۔ کچھ دیر تک روز کی طرح حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتے رہے پھر اپنے دیوان پر لیٹ کر سوچنے لگے۔!

ان کی آیندہ زندگی کی ساتھی کون اچھی رہے گی۔ کلب کی ممبر مس افروز۔ یا پھر وہ لڑکی جو دواخانے میں نظر آئی تھی۔ مس افروز ترقی پسند، فیشن ایبل اور بے باک تھی۔ لیکن وہ جو کلینک میں بیٹھی تھی۔ وہ عجیب چیز تھی مس افروز کے نام پر دل قلابازیاں نہیں کھاتا۔ لیکن اُس کا حُسنِ محجوب جو اُن کے بوڑھے دل میں بھی چنگاریاں سی بھر دیتا ہے۔

دانش نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ وہ گھر جانے سے پہلے ایک دفعہ کریمی صاحب کو ضرور دیکھ لیتے تھے۔ ان کے علاج اور علاج سے بڑھ کر تشفی آمیز باتوں نے کسی حد تک کریمی صاحب کو پُر امید کر رکھا تھا۔ وہ ضرور اچھے ہو جائیں گے؟۔ دو ایک مرتبہ دانش کی امی بھی کریمی صاحب کو دیکھنے اور ان کی بیوی سے ملنے آئیں۔

اس رات کو بھی دانش کو رخصت کرنے کے لیے عافیہ دروازے تک آئی تھی۔ ! ہمیشہ کی طرح خاموش۔ اداس۔ !

راہ داری میں نسبتاً تاریکی تھی۔ دانش نے باہر جاتے جاتے اچانک مڑکر اس طرح دروازہ بند کر دیا کہ عافیہ ہکا بکا رہ گئی۔ ! دانش کو ہنسی آ گئی۔

"نیت بُری نہیں۔ بس چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"یا اللہ ! آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ ابھی تک دل دھڑک رہا ہے۔ !"

"دیکھوں۔ ؟"

"ہٹیے۔ توبہ۔ !"

"عافیہ۔ !"

"ارے تو دروازہ کھول دیجئے نا۔!"

"دروازے پر پردہ تم نے ایسا لٹکایا ہے جو ماشاءاللہ جلمن ہو رہا ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ سڑک پر سے گزرنے والا ہر شخص ہمارے اظہار محبت کا ڈرامہ دیکھے۔؟"

"اظہارِ محبت۔؟ میں نہیں سمجھی۔" وہ جھوٹ موٹ بگڑی

"ارے بھئی! محبت کا اظہار کسی ہمدردی کے تحت بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"کہیئے جلدی سے اور جائیے۔"

"کیا؟ روز تو التجا کرتی تھیں کہ خدارا آئیے۔ اور اِس وقت یہ کہ جلدی سے جائیے ــ!"

"ابھی امی آواز دیں گی۔!"

"سنو۔ عافیہ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے تم اپنا سوگوار انداز اب یکسر بدل ڈالو۔ مجھے تمہاری یہ روتی بسورتی شکل اچھی نہیں لگتی۔! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ان خوشنما لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کی چاندنی کِھلی رہا کرے۔!"

"میرے بس میں نہیں۔" عافیہ کے ذہن میں بنیے کا بھجوایا ہوا وہ کاغذ پھڑپھڑانے لگا جو اس نے دوپہر کو بھجوایا تھا۔ جس پر دو ماہ کا حساب تقریباً چار سو روپے درج تھا۔!

"میرا مطلب یہ کہاں تھا کہ تم اور زیادہ اداس ہو جاؤ۔!" دانش نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اوپر اٹھایا۔ پل بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر عافیہ کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے۔

"بڑی مشکل تو یہ ہے کہ تم اپنی دشواریاں میرے سامنے نہیں رکھتیں۔" دانش نے اپنے رومال میں اس کے آنسو جذب کرتے ہوئے کہا۔ "کہہ دو مجھ سے۔ عافیہ۔ نئی پریشانی کون سی ہے۔؟ کیا میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا؟"

عافیہ کے لبوں تک بات آکر رہ گئی۔ اگر وہ اس سے مالی مدد طلب کرتی تو کیا دانش انکار کر دیتے؟ لیکن غیرت وشرم نے اس کے لبوں پر تالا ڈال دیا۔ کس طرح مانگے۔ کیوں کر ہاتھ پھیلائے۔

"بولو۔ عافیہ۔!" دانش نے اس کے گالوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

"جی۔ نہیں تو۔ نئی تو کوئی نہیں۔!"

"میری قسم؟"

اس نے نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔

"کچھ چھپا رہی ہو نا۔؟"

"اب مجھے جانے دیجئے۔!"

"مجھے افسوس ہے۔ عافیہ۔ میں ابھی تک تمہارا اعتبار حاصل نہیں کرسکا۔!"

"غلط سلط مت سوچئے۔"

"تو پھر؟"

عافیہ نے اس کے ہاتھ ہٹا دیئے اور مسکرا کر بولی:

"کچھ ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں؟۔"

دانش سمجھ چکے تھے کہ اسے کوئی خاص پریشانی تھی۔ اس کے گھر کی حالت ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ دو تین روز سے اپنی جیب میں ایک ہزار روپیہ لیے پھر رہے تھے۔ مگر اسے دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی! نجانے کیا سوچے؟ خفا ہو جائے۔ برا مان جائے۔ ملنا جلنا بند کر دے۔

غربت میں غیرت کے جذبات بہت شدید ہو جاتے ہیں۔

پھر دانش کو خیال آیا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ ان کا تکلف اور تذبذب کوئی اور تکلیف دہ سچویشن پیدا کر دے۔ لہٰذا انہوں نے جی کڑا کر کے کہا

"عافیہ! میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا تم سے۔ مگر ڈر تا تھا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میں نے تمہارے محسوسات کے ساتھ کچھ زیادتی کی ہے۔ اگر تم اجازت دو۔ تو۔ کچھ عرض کر دوں ـ!"

"عرض کروں کہ حکم دوں؟"

دانش ہنسنے لگے۔

"زہے نصیب! اب تو حکم دو۔"

عافیہ بھی ہنس دی۔

"عافیہ! خدا کی قسم۔ میں تمہیں غیر اور خود سے جدا نہیں سمجھتا۔ جب ہم تم ایک ہیں۔ تو ہماری ضرورتیں بھی ایک ہیں نا۔! سمجھیں میری بات؟"

"کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر۔ میری پیاری عافیہ! برا مت مانو! اور یہ حقیر رقم رکھ لو۔" دانش نے اس کے کچھ تکلف یا انکار کرنے سے پہلے ہی جیب سے لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھ میں دے کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا

ہاتھ دبا لیا۔

عافیہ کی پیشانی پسیج گئی۔ اس کا ہاتھ کسمسایا۔

"تمہیں خدا کا واسطہ۔ انکار مت کرنا۔ مجھے بڑی تکلیف ہو گی!"

"مگر ۔۔!"

"میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ کہ مجھ سے خود کو جدا مت سمجھو۔ اتنی معمولی سی ضرورتیں تو سب کو پیش آتی ہی رہتی ہیں۔ سنو۔ بھائی۔ میں تم سے پائی پائی دھروالوں گا۔ سمجھیں۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی!"

"واہ۔ کیسے نہیں آئے گی۔ میں اپنی ساری کمائی تمہارے ہی پاس تو رکھواؤں گا۔! میرا اور ہمارے بچوں کا خرچ تم ہی تو اٹھاؤ گی۔!"

دفعتہً حمزہ کی آواز آئی۔

"آپا! کیا چلے گئے دانش بھائی؟"

دونوں چونکے۔

دانش نے چپکے سے کہا۔ "خدا حافظ۔" اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔!

عافیہ آنچل میں لفافہ چھپائے اندر آئی۔

امی کریمی صاحب کے پاس بیٹھی ان کے بازو پر کسی تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ حمزہ دالان میں بیٹھا پڑھ رہا تھا! عافیہ بھی باپ کے پہلو میں ٹک گئی۔ انہوں نے رُخ پھیرا اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر بولے "کتنے دکھ کی بات ہے۔ بیگم۔ میری بچی بہت کمزور اور افسردہ خاطر

نظر آرہی ہے۔ میں اس سے بڑی خدمت لے رہا ہوں۔"

"ابا جان! کیا آپ کی خدمت مجھ پر فرض نہیں ہے۔" عافیہ بولی۔

"بیٹی۔ تم اپنی تعلیم سے غافل تو نہیں ہو گئیں؟"

"نہیں اباجان! مجھے تو بہرحال پاس ہونا ہے۔" عافیہ نے کہا اور سوچنے لگی کہ امی سے کس پیرایہ میں دانش کی مدد کا تذکرہ کرے گی۔! وہ ضرور سوال کریں گی۔ اگر دانش کو کچھ دینا ہی تھا تو براہ راست امی ہی کو کیوں نہ دیا۔؟ کہیں وہ کچھ اور نہ سوچ لیں۔

"کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟" اباجان نے کہا۔

"اباجان۔ میری ایک لیکچرر مسز جمیل نے کہا تھا کہ اگر میں پسند کروں تو وہ۔ مجھے کسی ہائی اسکول میں جاب دلوا سکتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اپنے والد صاحب سے پوچھ کر — !"

"نہیں بیٹی نہیں۔" کریمی صاحب نے بات کاٹ دی۔ "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم کیا جانو۔ آج کل اسکولوں اور کالجوں کا ماحول کتنا خراب ہے۔ لوگ ضرورت مندوں کی غرض سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ کچھ اس طرح اپنی نام نہاد ہمدردیوں کے جال میں جکڑتے ہیں بیٹی کہ پھر نکلنا مشکل ہوتا ہے اور وہی کرنا پڑتا ہے جو ہمدردوں کی مرضی ہوتی ہے —!"

عافیہ کا دل بیٹھنے لگا۔

"مگر اباجان! گھر کی حالت — !"

"اللہ مسبب الاسباب ہے بیٹی۔" کریمی صاحب نے آہ بھر کر کہا

اُسی نے یہ حالات پیدا کیے ہیں۔ وہی انھیں ٹھیک بھی کرے گا۔ وہ ہم سے غافل تو نہ ہوگا۔ !"

" میں تو کہتی ہوں کہ کوئی اسامی اگر کھڑی ہو تو آپ مکان کی بولی لگا دیجئے۔" بیگم کریمی نے کہا۔ "کیا فائدہ۔ اس کی تعمیر میں ابھی تک تیس ہزار لگ چکے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خرید ہی لے گا۔ اصل رقم بھی وصول ہو جائے تو بہت ہے۔ پرسوں نرسوں بہن زاہدہ کہہ رہی تھیں کہ اگر ——"

" آہ۔ میں نے کتنے شوق سے اسے بنوایا تھا۔" کریمی صاحب نے کہا۔ "مگر اسے بیچنا ہی پڑے گا! کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ اب میں اسے پھر سے بنوا سکوں گا۔ تم، زاہدہ بہن سے بات کر دیکھو۔ یا پھر ان کے شوہر شبیر صاحب مجھ سے مل لیں۔ اچھا ہے، وہ رقم ملے گی تو کچھ آسانی پیدا ہو جائے گی۔ لعنت بھیجو مکان پر اگر میں نہ بنوا سکا تو کیا۔ میرے بچے بنوا لیں گے۔"

" اباجان۔ گھر نہیں بکے گا۔ !" حمزہ بولا۔ "آپ نے کتنی محنت کی ہے اس کے پیچھے۔ مزدوروں کے ساتھ گھنٹوں کام میں لگے رہے ہیں اسے میں بنواؤں گا۔ !"

"کیسے بنواؤ گے؟" بیگم کریمی ہاتھ صاف کر کے دوسری کرسی پر جا بیٹھیں۔ اور مغموم نظروں سے حمزہ کو دیکھنے لگیں۔

" جب آپا ملازمت کر سکتی ہیں تو کیا میں نہیں کر سکتا؟ !"

"گنی بوٹی نیا منصوبہ۔" بیگم نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "بھول جاؤ مکان۔ اللہ بس تمہارے ابا کو صحت دیدے۔ ہمارے لیے یہی بہت

ہے۔ فی الحال تو دوا علاج کے لیے روپیہ چاہیئے۔!"

حمزہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ اور سر جھکا کر سوچنے لگا!

جب رات گئے بیگم اور عافیہ اپنے کمرے میں سونے گئیں تب ڈرتے ڈرتے عافیہ نے انہیں دانش کی رقم دی۔! اور چپکے سے بولی:

"میں نے انہیں منع کیا تھا۔ وہ مانے نہیں امی۔!"

بیگم کے چہرے پر کرب چھا گیا۔ "نجانے کتنوں کے سامنے شرم سے گردن جھکے گی۔ کل ہی زاہدہ بہن سے دو سو روپے قرض لے چکی ہوں!"

"انہیں واپس کر دیجئے امی! دانش صاحب تو پھر بھی اپنے ہیں۔" عافیہ نے کہا اور اپنی بات پر جھینپ کر ماں کی شکل دیکھنے لگی۔ مگر وہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ کچھ نہ بولیں۔

پھر عافیہ بھی اپنے پلنگ پر آلیٹی۔ نیند اسے بھی نہیں آرہی تھی۔ اس نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ بے ارادہ دانش کی مسکراتی ہوئی شبیہہ اس کی بند پلکوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ہمدرد مہربان چہرہ۔ محبت سے معمور آنکھیں۔ وہ اپنے تصور سے باتیں کرتے کرتے سو گئی۔!

مردانے سے چائے کی فرمائش لے کر ملازم لڑکا اندر آیا۔ اور بیگم کرمی سے بولا:

"صاحب نے کہا ہے کہ عمدہ چائے اور ساتھ میں کچھ اچھی چیزیں بھجوائیے"

"ہے کون چائے پینے والا۔" وہ بھنا گئیں۔ ابھی ابھی ناشتے کے بعد چولہے سے نجات ملی تھی۔

"کوئی صاحب لمبی سی موٹر پر آئے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔ پھر آنکھیں پھیلا کے حیرت سے بولا۔ "وہ تو سرکار کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کے خوب روئے۔!"

"روئے؟" ان کے اور عافیہ کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا۔ اتوار کا دن تھا۔ عافیہ گھر پر تھی۔ وہ بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ بولی:

"امی میں جھانک کر دیکھوں آخر ایسا کون سا ہمدرد آگیا ہے ابّا جان کے پاس؟۔"

"ہوگا کوئی۔ تم کیوں خواہ مخواہ آنکھوں کا گناہ مول لوگی۔" یہ کہہ کر بیگم کچن کی طرف ہولیں۔ عافیہ پھر سے سینے لگی۔

اس روز بیرسٹر صاحب اپنے دیرینہ دوست سے ملنے بالآخر پہنچ ہی گئے تھے۔ جس طرح وہ عدالت میں فریق مخالف کے گواہ پر جرح کرتے ہوئے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے وہی حربہ یہاں بھی آزمایا۔ لڑکے سے اپنی آمد کی اطلاع کروائی اور پھر ابھی وہ اجازت لایا نہ تھا کہ خود بھی اندر پہنچ گئے۔ اور بس نہ علیک سلیک نہ بیمار کی مزاج پرسی۔ بیمار کے پہلو میں پڑی کرسی پر بیٹھے اور رومال آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے!

کریمی صاحب ہکّا بکّا رہ گئے! نہ جان پہچان نہ اب کوئی تعارف آخر یہ صاحب تھے کون؟ ڈیل ڈول اور ظاہری شخصیت اتنی بارعب تھی کہ اس پر یہ بچوں کے سے آنسو۔ کریمی صاحب پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ان

بے چارے کو کوئی بڑی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی !

پھر ہمت اکٹھا کر کے وہ بولے :

"بھائی صاحب .... آپ ؟ ۔ میں شرمندہ ہوں ۔ آپ کو نہیں پہچانا میں نے ۔ اگر آپ ــــ !"

رومال کی رگڑ سے بیرسٹر صاحب کی موٹی موٹی آنکھیں خاطر خواہ سرخ ہو گئی تھیں ۔ انہوں نے بمشکل آنسو روکے ، اور گلوگیر آواز میں بولے "کیا پہچانو گے بھائی ۔ برس ہا برس تو گزر چکے ۔ یاد بھی نہ ہو گا تمہیں ہم تم آٹھویں سے دسویں تک ساتھ ساتھ رہے تھے ۔ یاد کرو وہ ۔ وہ جو ایک غبی اور کند ذہن سا لڑکا جو سب سے آخر میں بیٹھا رہتا تھا ۔ وہ ۔ میں ہی تو تھا ۔ تم نے اکثر مضامین میں میری کتنی مدد کی تھی ۔ بارہا میں تمہاری مدد سے پاس ہوا تھا ۔ میں ــــ !"

کریمی صاحب اپنے کمزور ذہن پر زور دینے لگے ۔ بات کم از کم یا تقریباً چالیس بیالیس برس پرانی تھی ۔ انہیں اس قسم کا کوئی خاص لڑکا یاد نہ آیا ۔ ان کی جماعت میں درجنوں لڑکے تھے ۔ بہتیروں کے تو نام بھی انہیں یاد نہ تھے ۔ مگر یہ بے چارے دیرینہ رفاقت کا حق ادا کرنے آ چکے تھے ۔ آج کل ایسے مخلص دوست کہاں ملتے ہیں ۔ کریمی صاحب ان کے بیان پر سو فیصدی ایمان لے آئے تھے ۔ بڑے پشیمان لہجے میں بولے :

"میرا دماغ اس نامراد بیماری نے اتنا کمزور کر دیا ہے جناب کہ میں نے اب بھی آپ کو پہچانا نہیں ۔ معاف کیجئے گا ۔ آپ نے اپنا اسم گرامی ــ !"

بیرسٹر صاحب نے پھر بات اچک لی ۔ "ارے ناصر ۔ تم اپنے عباد کو

بھول گئے۔ ذرا تو ذہن پر زور دو میرے بھائی۔ ! آج مجھے اپنے شفیق میاں سے معلوم ہوا کہ تم علیل ہو بھائی میں صبر نہ کر سکا۔ میں نے سوچا کہ تم اتنے دنوں نہ ملنے کی پاداش میں چاہے کتنا ہی برا بھلا کہہ لو مگر میں آج تم سے ملوں گا ضرور۔ ارے بھیا اتنی بھی کیا غیریت۔ کسی سے کہلوا نہ دیا کہ تم بستر پکڑے ہوئے ہو۔ واللہ میں ہزار کام چھوڑ کے آجاتا۔ .... اچھا تو علاج کس کا ہے ؟"

اپنی یادداشت کے دھوکا دے جانے پر کریمی صاحب بے حد شرمندہ تھے۔ کمزور آواز میں بولے:

"ظہیر بھائی کا لڑکا ڈاکٹر دانش علاج کر رہا ہے۔!"

بیرسٹر صاحب سب کچھ جانتے تھے۔ مگر سر ہلا کر بولے "اچھا اچھا۔ وہ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ کل کا لڑکا اتنا ماہر ڈاکٹر ہے۔ بھائی برا نہ ماننا۔ وہ تمھارا مرض بڑھا ضرور دے گا۔ گھٹا نہیں سکتا۔ ابھی کیا عمر ہے اس کی۔ اور پھر یہ مرض بڑی توجہ اور مستقل علاج چاہتا ہے۔ تم اگر مناسب سمجھو اور بھابی محترمہ کی رائے ہو تو میں تمہیں اپنی نگرانی میں سول ہسپتال لے چلوں۔ وہاں ایک آدھ مہینے تک تمھارا نہایت معقول علاج ہوگا۔!"

کریمی صاحب کے سینے سے ایک سانس نکلی۔ وہ چپ رہے۔ بیرسٹر صاحب نے اس کمرے میں قدم رکھتے ہی کمرے کے مکیں کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ یہاں آرائشی سامان کا سرے سے فقدان تھا۔ بس یہ آہنی پلنگ تھا جس پر کریمی صاحب ایک معمولی چادر بچھائے اور جگہ جگہ

سے سلا ہوا کمبل اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ سرہانے بدرنگ تپائی تھی۔ اس پر پرانا تھرماس اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف دیوار سے لگی ہوئی چار چھ کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک گوشے میں اونچے سے اسٹول پر پنکھا رکھا ہوا تھا۔ جس کے بلیڈز کا نیلا رنگ اب دھندلا ہو کر سرمئی سا ہو چکا تھا۔

کریمی صاحب کے سینے سے نکلی ہوئی مجبور سانس بیرسٹر صاحب کو یہ راز بھی سمجھا گئی کہ بیمار کسی گراں ہسپتال کے خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا وہ دل ہی دل میں خوش ہو گئے! بس لاسہ لگانے کی دیر ہے۔ پر ٹوٹے ہوئے پرندے کو دام میں آتے کیا دیر لگے گی۔!

"کیا خیال ہے؟" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ان کی خاص عادت تھی وہ مخاطب کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔ ان کے دماغ میں پھر ایک نسائی نازک سا ہیولی ابھرا۔ انہوں نے بے چینی سی محسوس کی۔

"میں نہیں سمجھا۔ کاہے کا خیال؟ —" کریمی صاحب نے پوچھا۔ وہ بڑی دیر سے ایک کروٹ پر لیٹے تھے۔ ان کا یہ پہلو دکھنے لگا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اندر سے عافیہ یا حمزہ آ کر انہیں دوسری کروٹ سے آرام سے لٹا دیتا۔ لیکن ان کے نام نہاد پرانے دوست جلد اٹھتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"یہی کہ۔ تم محترمہ بھابی صاحبہ سے رائے لو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے کے ہسپتال چلوں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ پھر ان کے چہرے پر تشویش اور فکر کے سائے پھیلنے لگے۔ "ویسے ہی تمہارے مناسب علاج میں تکلیف دہ تاخیر ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی وقت ہے۔ تکلف نہ کرو بھائی۔ چلے چلو۔"

کریمی صاحب جب سے بیمار پڑے تھے۔ برابر یہی سوچتے چلے جا رہے

تھے کہ واقعی ان کا معقول علاج نہیں ہو رہا تھا۔ افاقہ کی صورت ہنوز دور تھی۔ مرض جوں کا توں تھا۔ کم از کم وہ خود سے کروٹ تو لے سکتے ہ۔ اس طرح پڑے پڑے تو وہ سچ مچ اچھے ہونے والے نہیں۔ انہیں وہم ہوا کہ دانش ان کا علاج نہیں کر سکتے۔ وہ اس مرض کے ماہر نہیں۔ کچھ متوحش سے وہ بیرسٹر صاحب کی شکل تکنے لگے۔!

"ہاں ہاں سوچ لو۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

"ہم۔ ذرا۔ بیوی سے بھی کہہ دیکھوں۔" کریمی صاحب نے کہا۔ اور سوچا کہ بلا سے یاد نہ آئے کہ یہ اجنبی ہمدرد کون ہے۔ مگر ہے تو ہمدرد۔ کیسی پتہ کی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا دوست نہ ہوتا تو انھیں کیا پڑی تھی۔ اور بھی کالج کے ساتھی تھے۔ شروع شروع میں بے شک عیادت کے لیے آتے رہے تھے۔ مگر اب تو کوئی بھولے سے بھی شکل نہیں دکھاتا۔ سب کے سب منہ دیکھی محبت جتانے والے خود غرض۔ سنگدل۔ بے درد۔ انہیں بڑا دکھ ہوا۔ کیا اسی طرح ایڑیاں رگڑ کر ختم ہو جائیں گے؟ عمدہ علاج نہ ہو سکے گا۔ یہی افلاس سر پر شامیانے کی طرح تنا رہے گا۔! اور ان کے بچے۔ عافیہ کی شادی، حمزہ کی تعلیم۔ نامکمل مکان۔ اگر وہ اچھے نہ ہو سکے۔ یونہی معذور بنے بستر پر پڑے رہے تو پھر عافیہ کا کیا ہوگا حمزہ کا مستقبل برباد ہوگا۔ مکان یونہی رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے تیمار دار کل کو بیزار ہو جائیں۔ اگر وہ صحت مند ہو جائیں گے تو شاید اس قابل بھی ہو سکیں کہ پھر سے کسی قسم کی جائز آمدنی کی صورت پیدا ہو جائے۔

آناً فاناً ان کے دل میں سیکڑوں خیالات آئے اور طوفان سا مچا گئے بیرسٹر صاحب جو خاصے گرگ باراں دیدہ تھے۔ چہرہ کے تغیرات سے انسان کے

دل کی کیفیات کا اندازہ لگانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ پہچان گئے کہ ان کا چھوڑا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ لیکن انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کریمی صاحب کو خیالوں کے منجدھار میں چھوڑ دیا۔ اور کوئی فیصلہ نہ کیا۔ جلد بازی نہ کی۔!

کریمی صاحب جب سوچتے سوچتے تھک گئے تو انہوں نے اپنے ضدی خیالات کے بٹانے کی خاطر ملازم لڑکے سے کہا، اندر سے چائے لے آئے!

اتنی دیر خاموشی رہی۔!

بیرسٹر صاحب تب تک کچھ اور سوچا کیے۔!

پتہ نہیں۔ اب بیگم کی کیا کیفیت ہے؟ صبح کو تو بڑی تیزی سے سانس پھول رہی تھی۔ حالات قطعی اُمید افزا تھے۔ ہو سکتا تھا کہ بس شام تک وہ ایک انجام پر پہونچ جائیں۔ پیچھا چھوٹے! مگر بھئی! کریمی صاحب سے کیونکر کہا جائے گا۔؟ کیا وہ ان کی درخواست مان لیں گے؟۔ اور وہ ــ ان چھوئی گلستانِ شباب کی نودمیدہ کلی؟ــ وہ بھی ان کی رفاقت پر راضی ہو جائیگی اللہ سے اچھی امید لگانی چاہیے۔!

بہرحال وہ اس لڑکی کو چھوڑنے والے نہیں۔! بری طرح اس نے ان کے بوڑھے دل و دماغ پر قبضہ جمالیا تھا۔

دونوں اپنے اپنے خیالوں کے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔ اُبھر رہے تھے ایک کی سوچیں تعمیری تھیں، دوسرے کی تخریبی۔!

اتنے میں اندر سے چائے آگئی۔ ماحول کی خاموشی ٹوٹی۔ کریمی صاحب کو اندیشہ تھا کہ کہیں بیگم نے یونہی واہیات سی چائے نہ بھجوادی ہو۔ لیکن چائے معقول تھی

گھر کے بنے سموسے، شکر پارے اور دال موٹھ۔!

"بھائی یہ تکلیف کیوں کی۔؟" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

کریمی صاحب جو ابھی تک انہیں نہ پہچاننے کی بنا پر شرم سار تھے، بولے:

"یہ بھی کوئی چائے ہے۔ میں تو نادم ہوں کہ آپ کی خاطر خواہ کوئی ضیافت نہ کر سکا۔ اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو انشاءاللہ"

دہل کر بیرسٹر صاحب نے اپنے آپ سے کہا:

"خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے جب تم اچھے ہو۔ بڑی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ انہوں نے پھر بات ان کے منہ سے چھین لی۔

"ہاں۔ انشاءاللہ۔ تب کی بات اور ہو گی۔!"

اور اطمینان سے سموسے کھا کر چائے کے گھونٹ لینے لگے۔ کریمی صاحب نے ان کا جائزہ لیا، کتنا آسودہ حال آدمی ہے۔ لحیم شحیم۔ بارعب۔ متمول۔ کیا واقعی یہ ایک وقت میرا کلاس فیلو تھا۔ ان کا حافظہ پھر فیل ہو گیا۔

چائے کے بعد کچھ دیر اور بیٹھ کے ادھر ادھر کی بکواس کر کے بیرسٹر صاحب پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔! انہوں نے بالکل غیر اہم انداز میں اپنے سارے بزنس کے متعلق کریمی صاحب کو آگاہ کر دیا تھا۔!

"اب چلتا ہوں۔! عجیب مصیبت میں جان ہے۔ سارا حساب کتاب خود ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ہوٹل کی ایک روز کی آمدنی کی پڑتال نہ کروں تو پتہ ہی نہ چلے کہ کیا نفع ہوا اور کتنا مفت خوروں نے ہضم کیا۔ ادھر ایک درجن ٹیکسیاں شہر بھر میں چلتی ہیں۔ اکثر بے ایمان ڈرائیور روز کے روز اجرت دفتر میں جمع نہیں کراتے۔ اگر میں بھول جاتا ہوں تو وہ کم بخت بھی بھول جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

میری پرائیویٹ پریکٹس، اب کچہری نہیں جاتا۔ مگر موکل گھر پر کہاں چھوڑتے ہیں۔ صبح سات بجے سے رات کے بارہ ایک بجے تک دماغ کا خون تیل ہو جاتا ہے۔ تو مطلب یہ کہ ——— !"

کریمی صاحب متاثر ہو رہے تھے۔ ان کا جسم بیمار تھا۔ ذہن بھی بیمار ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ قدرت کے باغی ہو جاتے ۔! لہذا ان کی لن ترانی نے کریمی صاحب کو بہت متاثر کیا۔ مرعوب بھی ہو گئے۔ بولے:

"کیا آپ کے کوئی صاحبزادے۔ مطلب یہ کہ کوئی آپ کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔"

"صاحب زادہ تو خدا نے دیا ہی نہیں ناصر بھائی۔" وہ آہ سرد بھر کر بولے "لڑکی ہے۔ وہ بے چاری میرے کاروبار کو کیا جانے۔"

پھر وہ چلے گئے تب کریمی صاحب نے بیوی کو بلوا بھیجا۔

"کون صاحب آ گئے تھے ایسے گوند لگا کے"! وہ تنک کر بولیں۔ "میں اُدھر بے چین تھی کہ جانے ایک کروٹ پر لیٹے لیٹے آپ کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟ کوئی نئے ملنے والے تھے کیا؟"

تفصیل سنا کر کریمی صاحب نے کہا: "اب پھر دماغ پر زور دے رہا ہوں کہ وہ تھے کون؟ کب میرے کلاس فیلو رہے تھے؟ مگر کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔ خیر ہوگا کچھ۔ مگر بیگم ایسا ہمدرد۔ پرمحبت اور مخلص آدمی پہلی بار نظروں سے گزرا ہے واللہ۔ اس نفسا نفسی کے دور میں وہ تو فرشتہ ہے فرشتہ ۔!"

"عبدل کہہ رہا تھا کہ وہ آپ سے مل کر روئے تھے!" بیگم نے کہا۔

"ہچکیاں لگ گئیں ۔!" کریمی صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا؟"

"ہاں۔"

"بے چارے۔ آدمی کا دل ہو تو ایسا ہو۔"

پھر کریمی صاحب نے کہا:

"کہہ رہے تھے کہ ہسپتال میں شریک ہو جاؤ۔ علاج اچھا نہیں ہو رہا دانش نو آموز ہے۔ مرض بڑھ جائے گا تو پھر اس پر قابو پانے میں دشواری ہو گی۔ سچ ہی تو ہے۔ اب تو بستر پر پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ چیونٹی کی چال سے رینگتا ہوا یہ علاج بھی کوئی علاج ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد صحت ہو جائے تو پھر تمہارے اور بچوں کے مستقبل کے لیے کچھ کر سکوں۔ کالج سے رخصتوں پر رخصتیں کب تک چلیں گی۔ آدھی تنخواہ کب تک ملتی رہے گی۔ اس میں ہو گا کیا؟ تمہاری کیا رائے ہے؟ میری تو عقل چکر میں ہے۔"

"آپ نے نہیں سوچا کہ سرکاری ہسپتالوں میں بڑی درگت بنتی ہے۔ اور اور ذاتی ہسپتال میں دُونا دونی اخراجات ہوتے ہیں۔ یہی میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ۔ گھر اگر بک سکتا۔ تو شاید ــــ!"

"ہوں ــــ!" ایک ٹھنڈی سانس لے کر کریمی صاحب نے کہا۔

"تم نے اپنی سہیلی زاہدہ بہن سے کہا نہیں کہ وہ اپنے شوہر شبیر صاحب کو میرے پاس بھیج دیں۔"

"نہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کی مرضی نہ ہو۔"

"ہے میری مرضی۔!" جھلا کر کریمی صاحب نے جواب دیا۔ "تم ان سے کہو کہ میں شبیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

" اچھا۔ شام کو کہلوادوں گی۔ میں آپ کو کروٹ دلوادوں ؟ "

" تھوڑی سی چائے اگر ہو تو پلوادو۔ ! "

" آپ نے ان صاحب کے ساتھ نہیں پی ؟ "

" کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں ان سے کہتا کہ جناب چمچہ چمچہ چائے میری حلق میں ٹپکائیے۔ ! "

بیگم نے کیتلی میں جھانکا ! چائے نیم گرم تھی۔ آدھی پیالی بنائی اور کریمی صاحب کو پلا کے انھیں آرام سے لٹایا۔ آج کریمی صاحب کے پُرسکون خیالات میں تلاطم برپا تھا۔ انھیں کسی کی رفاقت بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کچھ بے رخی سے بولے :

" میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ نیند بھی آرہی ہے۔ تم جاؤ اور یہ دروازہ بند کرتی جاؤ۔ ! "

وہ دروازہ بند کرتی گئیں۔

تنہائی میں کریمی صاحب نے جہاں تک غور کیا، انہیں اپنے اجنبی ہمدرد کی رائے ہر طرح مناسب معلوم ہوئی۔ انہوں نے اپنے دل میں قطعی فیصلہ کرلیا کہ چاہے کچھ ہو۔ وہ ہسپتال چلے جائیں گے۔ !

عافیہ کو باپ کے فیصلے کا علم نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر دانش کے پاس سے دوائیں لانے چلی گئی۔ چونکہ تعطیل کے دن شام کو ان کا کلینک بند رہتا تھا۔ لہٰذا اس نے سوچا بات تیسرے دن جا پڑے گی۔ کریمی صاحب کے حق میں دوا کا ناغہ نقصان دِہ ہوتا۔ اور اس کے علاوہ عافیہ کی اپنی دل کی لگی بھی تو تھی۔ !

بیگم نے اس کے جانے کی خبر سنی اور بُرا سا منہ بنایا۔ لڑکی کو اطلاع دیئے بغیر تنہا نہیں جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے حمزہ سے کہا۔ وہ جا کے اسے لے آئے۔

حمزہ نے جواب دیا: " امی وہ کون سی نئی جگہ گئی ہیں۔ دن کا وقت ہے۔ آپ اس قدر ڈرتی کیوں ہیں۔ آپا چلی آئیں گی۔ ! "

بیگم اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ آج شاید کام کرنے والی بھی نہیں آئی تھی۔ ان کے سر کام کا بوجھ تھا۔ ملازم لڑکا عبدل باورچی خانے میں نل پر برتن دھو رہا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح الاپ رہا تھا۔ ڈفلی والے ڈفلی بجا۔ اور رکابیوں پر ڈفلی بجا رہا تھا۔ !

انہوں نے بے زار ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

گھر بھر میں عجیب منحوس طرح کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ جیسے عبدل کی بے سُری آواز زیادہ مکروہ بنا رہی تھی۔ !

کلینک میں ہجوم بہت تھا۔ عافیہ ایک بنچ پر بیٹھی اپنی باری کی منتظر تھی۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع ڈاکٹر کو بھجوا دی تھی۔ ایک ایک کر کے لوگ آجا رہے تھے۔ ! عافیہ نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے والے تھے۔ مطلب یہ کہ بس ایک گھنٹہ بعد کلینک بند ہو جائے گا۔ !

خدا خدا کر کے اس کی باری آئی۔ اس نے آنچل سے سر ڈھانکا اور لباس برابر کرتی چلی گئی۔ !

ہمیشہ کی طرح مسکرا کر دانش نے استقبال کیا۔ " آداب عرض محترمہ "

" کبھی تو مجھے بھی پہل کرنے دیجئے۔ " عافیہ گلابی ہو گئی۔

"پہل کرنے والے زیادہ ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔" دانش نے کہا۔

"اور زیادہ ثواب صرف آپ ہی کمانا چاہتے ہیں۔"

"اچھا۔ میں نے اپنا سلام واپس لے لیا۔"

اور جھک کر عافیہ نے کہا "تسلیم!"

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ ہزاری عمر دے۔" دانش نے دعائیں دینی شروع کیں۔ "خوب گورا گورا پڑھا لکھا ڈاکٹر دولہا ملے!"

"بس کیجئے۔ بہت بہت شکریہ۔"

"تم نے تو رسمی طور پر بھی مجھے دعا نہ دی کہ اللہ کرے میرے دل کی مراد جلد جلد پوری ہو جائے۔! ارے بھئی بیٹھ تو جاؤ۔ اب مجھے فرصت ہے کوئی باہر کھانس کھنکار نہیں رہا۔ مطلب یہ کہ اطمینان سے بیٹھو تو بہت سی باتیں کریں۔!"

"دوا دیجئے تو میں چلوں۔ باتیں کرنے نہیں آئی۔" عافیہ ان کے سامنے اسٹول پر ٹک گئی۔!

"بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"ارے بات وات کیا۔ دیر ہو جائے گی تو گھر میں ڈانٹ نہیں پڑے گی"

"کہہ دینا کہ۔ دانش سے پیار بھری باتیں کر رہی تھی۔!"

"ہائے اللہ!"

دانش ہنسنے لگے۔ "اس طرح ہائے وائے کرتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو"

"آج آپ کو ضرور کچھ ہو گیا ہے۔"

"ارے دن بھر اور رات گئے تک مریضوں میں گھرا بیٹھا رہتا ہوں بور ہو

جاتا ہوں۔ اتنا بھی حق مجھے نہیں کہ کسی سے چند باتیں پیار بھری کر لیا کروں۔ سچ عافیہ۔ تم یقین کرو کہ نہ کرو۔ میں کام تو اپنا کرتا رہتا ہوں مگر میرا دھیان پورا تمہاری طرف لگا رہتا ہے۔ کیا کر رہی ہو۔ سوچ تو نہیں رہی ہو۔ ان حسین پیاری پیاری آنکھوں میں خدا نخواستہ آنسو تو نہیں آ گئے ہیں۔ کوئی فکر تو نہیں ہے۔ اور بس پھر میرا جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے یہ سارا کاروبار یونہی چھوڑ چھاڑ کر تمہارے پاس چلا جاؤں۔ اچھا۔ تم بتاؤ۔ کبھی تم نے بھی مجھے اس طرح یاد کیا۔؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"کمال ہے۔ کیا نہیں معلوم؟"

"اپنے دل کا حال۔!"

"کیوں؟"

"دل کی دھڑکنیں گننا، دل کی آواز سننا آپ کا کام ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا دل کا حال۔!"

"سچ مچ دل خوش کر دیا تم نے۔ مانگو۔ کیا مانگتی ہو؟"

ایک دزدیدہ نگاہ دانش پر ڈال کر وہ بولی:

"اب اور کیا مانگوں۔ سب کچھ تو آپ نے بن مانگے دے دیا ہے۔!"

اس جواب نے دانش کو مبہوت کر دیا۔ وہ آخر اپنے جی کی بات کہہ گزری تھی۔ الفت کا چراغ اگر دانش کے دل میں روشن تھا تو اس کا اجالا عافیہ کے دل کے آنگن میں بھی پھیلا ہوا تھا۔

"عافیہ!" وہ فرط جذبات و مسرت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے

"وہ وقت کب آئے گا جب میں ہمیشہ کے لیے تمہارا ہاتھ تھام کر اپنے گھر لے آؤں گا !۔ عافیہ۔ میں نے امی سے کہا تھا زندگی کے ساتھی کے طور پر میں نے عافیہ کو پسند کر لیا ہے۔ تب امی نے ________ !"

"اللہ! آپ نے مجھ بچی کو صورت دکھانے کی بھی جگہ نہ رکھی۔" شرما کے عافیہ نے اپنے دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھ لیے۔ "اب وہ مجھے کبھی دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی۔ !؟"

"سنو تو تم۔ وہ کیا سوچیں گی۔ یہ ایک الگ بات ہے۔" دانش نے اسے چپ کر دیا۔ "جب میں نے امی کو اپنی پسند سے آگاہ کیا۔ تب انہوں نے بھی کہا کہ تم انھیں بہت اچھی لگتی ہو۔ تم خوب صورت ہو۔ سلیقہ شعار ہو۔ پُرمحبت ہو۔ تم میری زندگی بنا دو گی۔"

وہ سر جھکائے فرش کو تکتی رہی۔

"سن رہی ہو ؟"

"جی۔"

"تھام لوں تمہارا ہاتھ۔ ؟!"

"کیا آپ کو۔ میری اجازت کی ضرورت ہے ؟"

"عافیہ۔ سچ مچ۔ تم بہت اچھی ہو۔ !"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ دانش اس کا چہرہ تک رہے تھے۔ اتنی بے تحاشہ حسین نہیں ہے۔ مگر کتنی اچھی لگتی ہے۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں۔ ننھے منے گلابی گلابی لب۔ نازک نازک سا جسم۔ آج کل کی لڑکیوں کی سی بے باک، اونچی آواز سے ہنسنے والی۔ نظروں سے نظریں ملا کر گفتگو کرنے والی

نہیں۔ جب اپنی مدھم آواز میں چپکے سے کچھ کہتی ہے تو اچانک اس کے سفید رخساروں پر کتنی دل کش گلابی بکھر جاتی ہے۔ جیسے جو کچھ کہتی ہو اس پر دفعتہً شرما گئی ہو۔!
عافیہ نے پلکیں اٹھائیں۔
دانش گڑبڑا گئے۔
وہ مسکرانے لگی۔
"آپ نے باتوں میں لگالیا۔ دوا دیجئے تو میں چلوں۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ امی سے جھوٹا بہانہ بنانا پڑے گا۔ آپ کے پاس ہجوم بہت تھا۔!"
"امی مجھ سے باتیں کرنے کو منع کرتی ہیں؟"
"وہ تو منع نہیں کرتیں۔ مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ وہ میرے بارے میں کوئی نامناسب بات سوچ لیں۔ یا مجھے ان سے سوال جواب کرنے پڑیں۔!" وہ سادگی سے بولی۔
"ہاں۔ بہت ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بزرگ آدمی بعض وقت جو سوچتے ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ نامناسب نہیں ہوتا۔!"
پھر دانش نے دو ایک دوائیں اسے دیں اور لجاجت آمیز پیرائے میں بولے
"سنو۔ تم سے جی بھر کے باتیں ہی نہیں ہوئیں۔ مجھ سے کہیں ملو۔!
"کیسے ملوں۔ یہ ناممکن ہے۔" عافیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور پھر آپ کیا سوچیں گے؟"
دانش اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں کیا سوچوں گا؟ کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا!"

اور بے حد سادگی اور بھولپن سے عافیہ نے کہا۔
"آپ یہ سوچیں گے کہ کتنی بے حجاب لڑکی ہے! اگر میری بجائے کوئی اور ہوتا تو یہ اس سے بھی اکیلے میں ملتی۔ میں تو آپ کے خیالات بھی خراب کرنا نہیں چاہتی۔!"
"نہیں نہیں۔" دانش نے جلدی سے کہا۔ "خدا کی قسم میں ایسا نہ کہوں گا نہ سوچوں گا۔! تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔؟!۔"
"باتیں تو آپ نے کریں۔" دانش کے برا مان جانے کے ڈر سے وہ جلدی سے بولی۔
"یہ بھی کوئی باتیں ہوئیں۔" دانش نے کہا۔ "جگہ بھی بڑی مناسب ہے۔ رومان پرور فضا، عمدہ ماحول۔ ہوائیں آئیوڈین کی حسین خوشبو۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے آس پاس طبلۂ عطار ہو۔!"
عافیہ ہنسنے لگی۔ "اچھا اب میں سمجھی۔ آپ کو واہیات باتیں کرنے کے لیے خوشبودار فضا چاہیئے۔ بھلا وہ کہاں ہے؟ آپ کا یا میرا گھر بھی تو کوئی گلستاں یا پارک نہیں ہے۔!"
"تو کیا پارک یا چمن شہر بھر میں کہیں ہے ہی نہیں۔؟"
"توبہ توبہ۔ میں ایسی جگہ نہیں آسکتی۔!"
"اچھا تو پھر ہم کسی ہوٹل یا عمدہ سے کیفے میں جا بیٹھیں گے!" دانش نے تجویز پیش کی۔
"اے ڈاکٹر صاحب! ذرا حواسوں میں رہیئے۔" عافیہ نے للکارا۔ "میں بھلا آپ کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھوں گی!؟"

"بڑی دقیانوسی ہو۔ آخر اس میں حرج کیا ہے ؟"

"نہ۔ میں نہیں جانے کی۔ نہ پارک نہ ہوٹل۔ آپ کو اگر آنا ہو تو غریب خانے ہی پر آیئے۔ اب بس۔ میں چلی۔ میرے خدا۔ پونے ایک ہو رہا ہے۔ آج مجھے امی کی ڈانٹ ضرور کھانی پڑے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔!"

"عافیہ۔ ایک بات تو سن جاؤ!۔"

وہ زینے سے اتر چکی تھی۔ مڑکر ہاتھ ہلا دیا اور ہنس کر بولی:

"رات کو گھر پر۔ آپ کی سب باتیں سن لوں گی!۔"

دانش بے حد خوش تھے۔ انہوں نے اس کا امتحان لیا تھا۔ کیا ہوتا ان کے بلند خیالات کا حشر۔ اگر وہ ریشہ خطمی ہو جاتی۔ ان کے ساتھ تنہائی میں ملنا منظور کر لیتی۔

دونوں ہتھیلیاں زور زور سے رگڑتے ہوئے وہ آپ ہی آپ ہنسے۔ سیٹی بجائی اور لڑکے کو پکارا۔

لڑکا حیران تھا۔ جب بھی وہ گوری سی بی بی آ کے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جیسے کوئی خزانہ مل جاتا ہے۔ آپ ہی آپ ہنستے ہیں۔ اتنے خوش نظر آتے ہیں کہ بس۔!

"اب اور تو کوئی نہیں ہے نا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ صاحب۔!"

"اچھا تو اب دواخانہ بند کر دو۔" دانش ہنسے۔ "شام کا تمہارا کیا پروگرام ہے۔! آج چھٹی ہے نا؟ کون سا فلم دیکھنا ہے۔؟"

"جی صاحب۔" وہ شرما گیا۔ "فلم تو میں دیکھتا ہی نہیں ہوں۔

اماں کہتی ہیں کہ گناہ ہے۔"

"ارے اماں کو کیا معلوم۔ ان سے کہو۔ اتوار کے دن فلم دیکھنا گناہ نہیں ہے۔ سمجھے۔ اچھا۔ یہ رکھ لو۔ اب ٹکٹ کے پیسے۔ !" انھوں نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھا۔ "کل ملیں گے۔ اچھا۔"

"اچھا صاحب۔ بہت اچھا۔" وہ خوش ہو گیا۔

عافیہ نے گھر پہنچ کر ماں کا موڈ قطعی آف دیکھا۔ ! انہوں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ عافیہ نے بڑی کراہیت سے جھوٹ بولا۔

"ہجوم بہت تھا امی۔ دیر تک انتظار کرنا پڑا۔"

"تم مجھ سے پوچھ کر تو جاتیں۔" امی نے کہا۔

"میں حمزہ سے کہہ کر گئی تھی۔ اس نے آپ کو نہیں بتایا۔"

"بیٹی۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا۔ امی۔" سَن سے کوئی چیز اس کے سینے نکل گئی۔

"ہاں۔ تمہارے ابا نے طے کر لیا ہے کہ اب ہسپتال میں داخل ہو جائیں گے۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولیں۔ "دانش کی دوا پر انہیں بھروسہ نہیں رہا ابھی دو گھنٹے تک میں نے انہیں سمجھایا تھا مگر اب وہ میری مانتے نہیں۔ کوئی پرانے دوست آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اس طرح ٹھیک نہ ہوں گے نجانے کیا افسوں پڑھ کے پھونکا ہے کہ تمھارے ابا جو اسپتال کے نام سے ہی ڈرتے تھے۔ اب خود ہی جانے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ مجھے تو اس منحوس گھر کا سودا ہوتا بھی نظر آرہا ہے۔ رات کو شبیر صاحب کو بلایا ہے۔ خدا بچائے۔ مجھے تو بہت برے دن آتے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"امی۔ میں اباجان سے بات کر کے دیکھوں۔؟" ڈوبتے دل سے عافیہ بولی۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ آج تو وہ دانش کو اپنے گھر پر مدعو کر آئی ہے۔ نہ جانے اباجان ان سے بھی کوئی دل شکن بات کہہ گزریں۔

"نہ بیٹی۔ ابھی نہیں۔" امی نے اسے منع کر دیا۔ "حمزہ کچھ پوچھنے گیا تھا۔ اسے بڑی زور سے ڈانٹ دیا۔ آج انہیں بہت غصّہ ہے۔ کیا کریں ایک جگہ پڑے پڑے وہ بھی عاجز آگئے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔"

"وہ صاحب جو آئے تھے، کون تھے امی۔" عافیہ نے دوا میز پر رکھ دی اور اپنے بے جان وجود کو سنبھال کر ماں کے پاس آبیٹھی۔

"میں کیا جانوں بی بی۔ وہی کہہ رہے تھے بہت پرانے ساتھی تھے۔"

"گھر بک جائے گا۔ امی۔!"

"گھر کا تذکرہ مت کرو۔ میرے دل پر مو گری سی چلتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے دو منزلہ بنواؤں گی۔ اوپر کا حصہ کرائے پر دے دوں گی۔ اس طرح تمھارے لیے کچھ جمع ہوتا رہے گا۔ حمزہ کی پڑھائی کا خرچ نکل آئے گا مگر بندہ کچھ اور سوچتا ہے۔ خدا کچھ اور کرتا ہے۔" امی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "اب تو میں دعا مانگتی ہوں۔ خدا میرا سہاگ سلامت رکھے۔ میری گود آباد رکھے۔ گھر پھر بن جائے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنچل آنکھوں پر رکھ لیا۔

نظر آنے لگے گی۔ ! وہ بیحد خوش تھے۔ کتنی صفائی سے بے چارے بیمار کو بیوقوف بنایا تھا۔ اس کے گرد جال تو ڈال دیا تھا۔ اب صرف اسے سمیٹنے کی دیر تھی۔ لیکن پھر اچانک ان کے حسین خیالات کے افق پر وہ بدنما گوشت کا پہاڑ ابھرنے لگتا۔ جسے لوگ **ان** کی بیوی کہتے تھے۔

لانے کو تو وہ اب بھی نئی بیوی لا سکتے تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ بیگم ایک حشر برپا کر دیں گی۔ تعجب نہیں جو بے چاری نئی کو بدحواس کر دیں۔ لہٰذا وہ دل سے چاہتے تھے کہ یہ پہاڑ پگھلے تو اس کی جگہ نئے محل کی بنیاد رکھیں۔ اور شامت یہ تھی کہ بیگم کسی صورت سے کھسکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ بے حد جاں فزا اُمیدیں لے کر ان کے پاس جاتے۔ اور خدا سے دعائیں مانگ کر جاتے کہ کسی صورت سے انہیں ان کے سوالوں کے جواب اثبات میں ملیں۔

اکثر یہی ہوتا۔

"بیگم۔ اب کچھ دل میں تو تکلیف نہیں۔ ؟"

کاش کہہ دیں۔ بہت تکلیف ہے۔ لگتا ہے کہ اب رکا کہ تب رکا۔ سینے سے باہر نکلا جا رہا ہے۔

مگر وہ خاصی کراری آواز میں جواب دے کر بیرسٹر صاحب کی امیدوں کا قتل عام کر دیتیں۔

"نہیں تو۔ اب اللہ کا فضل ہے۔ !"

"سانس تو نہیں پھولتی۔" ارے بدبخت کچھ تو حوصلہ بندھا دے۔ آج نہ سہی کل سہی۔ دنیا امید پر قائم ہے۔

"سانس بھی نہیں پھول رہی۔"

خدا غارت کرے۔

"اچھا تم چلتی پھرتی ہو تو خود تمہیں اپنا وزن زیادہ تو نہیں لگتا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

وہ میاں کی پرسش اور محبت پر مسکرا دیتیں۔

اس وقت بیرسٹر صاحب کا دل چاہتا کہ خودکشی کر لیں۔ اور کہہ دیں اس کم بخت سے۔ اب تیرا جتنا جی چاہے۔ زندہ رہ لے۔ ناہنجار، لے۔ میں خود مرا جاتا ہوں۔

انہوں نے دانستہ ڈاکٹر دانش کا علاج ترک کر دیا۔ اور ایک نیم حکیم عطائی سے جڑی بوٹیوں کی ناقص دوا بیوی کو کھلانا شروع کر دی۔ انھیں کسی سے معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر دانش عنقریب ماہر امراض قلب کی بھی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور شاید اس گروپ کے ساتھ کہیں باہر بھی جانے والا تھا۔ بیرسٹر صاحب کو خاصہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بیگم صاحبہ کے دل پر قابو نہ حاصل کر لے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی کوئی تدبیر کارگر ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دل کو اس کے اصلی حجم پر لے آئے۔ بڑا غضب ہو جائے گا! لہٰذا اس اندیشے کے تحت انہوں نے بے چارے کا پتہ صاف کر دیا۔ اور کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح بیگم کا دل اس قدر بڑھ جائے کہ سینے کی وسعتوں میں ٹھنس کر رہ جائے۔ اس کم بخت کے دھڑکنے کی جگہ ہی باقی نہ رہے گی تو لامحالہ رُکے گا۔!

ان کی بہترین آرزوؤں کے مطابق عطائی صاحب نے ایسی ایسی تیر بہدف دوائیں مرحمت فرمائیں کہ بدبختی سے روبصحت ہونے والی بیگم صاحب

خوش قسمتی سے از سر نو پڑ گئیں اور اس طرح پڑیں کہ جان کے بھی لالے پڑ گئے!

بیرسٹر صاحب کی "پریشانیوں" کا کیا پوچھنا۔ راتوں کو سوتے تک نہ تھے۔ خواب گاہ سے اٹھ اٹھ کے آتے اور بیوی کی سانسیں گنتے۔ جو بھی ان کی پریشانی دیکھتا۔ افسوس کرتا۔ آخر کو ایک عمر کا ساتھ ہے۔ بھلا ان سے بیوی کی تکلیف کیسے برداشت ہوگی!۔

ان دنوں فاخرہ نے بھی سنجیدگی سے ماں کی طرف توجہ کی تھی۔ اسے کبھی ماں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔! بچپن اور ہوشمندی کا زمانہ گورنسوں اور آیاؤں کی صحبت میں کٹ گیا۔ شباب آیا تو خود مختار آیا۔ اب اسے ماں کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن انہیں واقعی بیمار دیکھ کر اُسے فکر ستانے لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ختم ہو جائیں گی تو کیا ہوگا۔ بلکہ اس لیے کہ ان ہی دنوں ایک بڑے متمول مِل اونر کے صاحب زادے راحیل سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ اور اسے ڈر لگا ہوا تھا کہ اگر ممی چل بسیں، تو پھر ان کی کورٹ میرج اور ہنی مون کہیں دور جا پڑے گا۔ شرما شرمی میں اسے گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔ بھلا ڈیڈی بھی اتنی جلدی شادی کی اجازت کیوں دیں گے

والد صاحب کو صاحب زادی کی مصروفیات کا علم نہیں تھا۔ ان سے اُن کے نام چار کے سکرٹیری نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا:

" جناب۔ وہ جو آپ کے حریف تھے۔ جن سے آپ کا مقدمہ دس سال تک چلتا رہا تھا۔ ان کے صاحب زادے آج کل صاحب زادی کے ساتھ ساتھ دیکھے جا رہے ہیں۔"

بیرسٹر صاحب نے آنکھیں پھیلا دیں۔ " ہائیں۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

فاخرہ کو بخوبی پتہ ہے کہ راحیل کا باپ ہمارا کھلا دشمن تھا۔ پھر اس نے اس کے لونڈے سے کیونکر دوستی بڑھالی ۔" اماں نہیں۔ تمہیں شبہ ہوا ہوگا۔"

" جناب عالی! میں بھی یہی سمجھا تھا" سکریٹری نے جواب دیا۔" لیکن میں نے بار بار راحیل اور صاحبزادی کو ساتھ دیکھا۔ سکندر آباد کا مشہور نائٹ کلب تو دونوں کا مستقل ــــــ!"

" نائٹ کلب ؟ ۔ ارے یہ الو کی پٹھی نائٹ کلبوں میں بھی جانے لگی ہے؟ بیرسٹر صاحب کا پارہ گرم ہونے لگا۔

" وہ تو خیر کوئی ایسی معیوب بات نہیں قبلہ ۔" سکریٹری نے مسکراہٹ کو ضبط کر کے کہا۔" مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ کے جانی دشمن کا لڑکا نجانے کس مصلحت سے صاحب زادی کو یہاں وہاں لیے پھر رہا ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ کہیں راحیل کے والد نے بھی صاحبزادی کو بیٹے کے ساتھ دیکھ لیا تو پھر آپ پر نہ چڑھ دوڑے کوئی نہ کوئی ناز یبا بہانہ گڑھ کے ۔"

" ہاں ہاں اور کیا۔ جب بدنام ہی کرنا ٹھہرا تو وہ تو ہزار طرح کے شرمناک بہانے گڑھ سکتا ہے۔" بیرسٹر صاحب نے روا روی میں کہا پھر پوچھا :

" فاخرہ کہاں ہے۔ کسی سے دریافت کرو۔ اگر وہ گھر پر ہو تو میرے پاس بھیج دو ۔!"

" جی بہت اچھا ۔!" سکریٹری نے کہا۔

حسن اتفاق سے فاخرہ گھر پر موجود تھی ۔ لیکن بہت مصروف تھی۔ اس کے پاس کالج اور کلب کی سہیلیوں کا جمگھٹا تھا۔ اور کمرے میں

طوفان بے تمیزی شباب پر تھا! ماں باپ کی موجودگی کو سراسر فراموش کئے ہوئے فاخرہ لڑکیوں کی بے ہودگیوں میں برابر کی شریک تھی۔!

اس کا کمرہ ماں کی خواب گاہ سے دور تھا۔ یہاں کی دھما چوکڑی کی آواز بیگم صاحبہ کے کمرے تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی کمرے سے باہر خاصی دور تک طرح طرح کی آوازیں اچھی خاصی گونج رہی تھیں۔

ٹیپ ریکارڈر پر انگریزی موسیقی کا کیسٹ چڑھا ہوا تھا۔ ایک لمبے قد اور بھاری جسم کی لڑکی جس نے پتلون اور جرکن پہن رکھی تھی۔ مرد بنی تھی۔ دوسری دبلی پتلی چھوئی موئی سی لڑکی اس کی بانہوں میں سمائی ہوئی تھی۔ اور دونوں آپے سے باہر رقص کر رہی تھیں۔ ایک بھدّے خط و خال کی لڑکی شان دار ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔!

ان کی آپس کی گفتگو کا کہنا ہی کیا۔ کہیں اپنے سنسنی خیز رومان کے عملی تجربہ کا تذکرہ تھا۔ کہیں کسی احمق کو پھانسنے اور اسے مزید احمق بنانے کی دلچسپ گفتگو، بیچ بیچ میں فحش فقرے بازی اور بے حجاب قہقہے۔

فاخرہ الماری کھولے کھڑی تھی۔ اور ناقدانہ نظروں سے ہینگرز پر لٹکے ہوئے ملبوسات کو دیکھ رہی تھی۔!

"شام کو جینز اور جرکن ہی میں چلنا۔" ایک سہیلی نے رائے دی۔ "تمہارے حسین جسم کا ایک ایک پیچ و خم نمایاں ہو جاتا ہے۔ رئیلی۔ قیامت ہو جاتی ہو اس لباس میں۔ بائی گاڈ۔ میں نے بہتیروں کو للچائی نگاہوں سے تمھیں گھورتے دیکھا ہے۔!"

"مگر سوچتے رہ گئے ہوں گے۔" دوسری نے لقمہ دیا۔ "یہ رنگیں تتلی

جال میں آنے سے پہلے ہی پھر سے ہو گئی۔ !" بے تکی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔
"اوہ۔ شٹ اپ۔ !" فاخرہ باریک آواز میں چیخی۔ "مذاق چھوڑ دو اور مجھے بتاؤ۔ رات کے فنکشن میں کون سا لباس پہنوں۔ ؟"
"یہ ڈارک براؤن جس پر چمکیلے ستارے کھلے ہوئے ہیں۔ کیا چیز ہے ؟"
"یہ والی۔ ؟" ایک کپڑے پر انگلی رکھ کر فاخرہ نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"ساڑی ہے۔"
"سو بیوٹی فل۔ یہی پہن لو۔"
"کیا ؟ ۔" فاخرہ نے آنکھیں نکالیں۔
"کچھ پاگل ہوئی ہو۔ رات رقص کا مقابلہ ہے۔" ایک محترمہ نے کہا۔
"رقص میں ساڑی کا کیا کام۔ الجھ گئی پیروں میں تو۔ ؟"
"ہاں سچی۔" ایک اور نے کہا۔ "ساڑی والی پرانا لباس ہو گیا اس کے علاوہ رقص میں ساڑی مقابل کے ہاتھ میں نہ رہ جائے گی۔ ؟"
"ڈونٹ بی سلی ! سمجھیں۔" فاخرہ بولی۔
"بس تو پھر پتلون اور جرکن۔ !"
"اچھا بھئی۔ !"
"تمھارا مقابلہ کس سے ہے ؟" ایک اور نے پوچھا۔
"وہی ہے۔ جس نے کل سوئمینگ پول پر ڈائیونگ کے کمال دکھائے تھے۔ !" فاخرہ بولی۔
"آج وہ پھر غوطے کھائے گا۔ !" وہ صاحب زادی ہنس دیں۔

"بھئی آج کل غوطے چاہے کوئی کھائے۔ مگرا بھر رہا ہے۔ پرنس چارمنگ راحیل۔" ایک صاحبزادی نے فرمایا۔" یور ینگ فیلو۔ پالتو بل ڈاگ کی طرح فاخرہ کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔"

"بلڈاگ ؟۔ ہائے۔ ارے وہ تو خوبصورت سا اسپنیل ہے!"

"تم لوگ بکواس بند کرو۔" فاخرہ نے دھڑام سے الماری کا پٹ بند کردیا۔ اور بانہہ پر اپنا لباس لٹکائے ان کے پاس آ گئی۔ "میں ذرا نہا کے آتی ہوں۔ تم تب تک کسی سے کہہ کر کافی چائے یا ڈرنک منگوالو۔!"

"جلدی آجانا بھئی۔!"

"جسٹ اے منٹ !۔"

تبھی ایک ملازمہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ میوزک بند ہو گئی۔ سب دوڑ دوڑ کر صوفوں پر گریں۔ فاخرہ ملازمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کیا ہے۔؟" اس نے بے چاری کو جھنجوڑ کھایا۔

"سرکار نے آپ کو بلایا ہے صاحب زادی۔" وہ گھگھیائی۔

"دہاٹ نان سنس" فاخرہ نے پیر پٹخ کر کہا۔" ارے یہ بڈھا آج ابھی تک گیا نہیں۔" اس نے جھٹکے سے اپنے کھلے بال پیچھے کیے اور بُرا سا منھ بنا کر بولی:

"جاکر کہہ دے آتی ہوں۔!"

ملازمہ کے جانے کے بعد وہ بھن بھنائی:

"اب پتہ نہیں۔ رنگ میں کیا بھنگ کریں گے یہ حضرت بھی۔! ناک میں دم آگیا ہے۔ اِدھر آؤ۔ اُدھر جاؤ۔ ہونہہ۔!"

"بھئی تم بڑی ہو تو ہم چلتے ہیں۔" ایک لڑکی بولی۔ "ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ڈیڈی کی گود ہی میں بیٹھی رہ جاؤ۔ اور اُدھر پروگرام شروع بھی ہو جائے"

"ہُنھ !" فاخرہ نے ہونٹ سکوڑ لیے۔ اور اسی لباس میں اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ وہ پتلون اور جرکن پہنے تھی۔ بھلا پتلون پر بھی کسی نے دوپٹہ اوڑھا ہے ؟۔ وہ تو عادی تھی اسی لباس کی۔ جسے دیکھ کر بیرسٹر صاحب ہمیشہ نظریں جھکا لیتے تھے۔ !

"مے آئی کم اِن ڈیڈ ! ۔ ؟" اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔ بیرسٹر صاحب کمرے کی وسعتوں میں ٹہل رہے تھے۔ رک کر مڑے اور الماری کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ !

" آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ یہاں ۔ !" انہوں نے کہا۔

وہ مٹک مٹک کر آگے بڑھی اور بیرسٹر صاحب کے سامنے بیٹھ گئی۔ بیرسٹر صاحب نے اسے گھورا اور بولے :

"جو کچھ میں پوچھوں۔ اس کے جواب میں سچ سچ کہنا۔"

اور جواب میں فاخرہ بے ساختہ ہنس پڑی

"کیوں ۔ کیا بات ہے۔ ؟" بیرسٹر صاحب کو سخت ناگوار گزرا۔

" اوہ ڈیڈی۔" وہ بدستور ہنستی چلی گئی۔ " یہ تو عدالت کی سی گفتگو ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہنا۔ سچ کے سوا کچھ نہ کہنا۔"

" بکواس بند کرو ۔ !" وہ دھاڑے۔ "مجھے جواب دو۔ وہ کون بدمعاش ہے۔ جس کے ساتھ تم پھرتی دیکھی گئی ہو۔ ؟"

" آپ سے یہ کس نے کہا۔ ؟"

"تم یہ بتاؤ۔ وہ بدبخت الّو کا پٹھا ہے کون۔؟"

"کوئی نہیں ہے۔!"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"ڈیڈی۔ آپ کا کام ہی جھوٹ بولنا۔ جھوٹ کا سننا ہے۔" فاخرہ نے جواب دیا۔ "آپ جھوٹ ہی کو سچ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ۔۔!"

بیرسٹر صاحب اپنے زبردست ہاتھ کی مٹھی بنانے لگے۔ ہونٹ چبانے لگے۔ اسے خوں خوار نظروں سے گھورنے لگے۔ اور اس کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ ویسے دل چاہ رہا تھا۔ بدتمیز کی بوٹیاں اُڑا دیں۔ فاخرہ بڑی دلیری سے باپ کو گھور رہی تھی۔ اس نے نظریں نیچی نہ کیں۔

"تم جانتی ہو۔" دفعتہً بیرسٹر صاحب ابل پڑے۔ "وہ لونڈا میرے جانی دشمن صلاح الدین کا بیٹا ہے۔ صلاح الدین نے مجھ سے دس سال تک مقدمہ لڑا ہے۔ میرے تباہ کرنے میں اس خبیث نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ مجھ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ بھی کروایا تھا۔ یہ بات اس کا لڑکا بھی جانتا ہوگا۔ اور۔ تم نے اس سے دوستی بڑھائی ہے۔ کیا تمہیں میری اور اپنی عزت اور پوزیشن کا کچھ بھی خیال نہیں ہے۔؟!"

"وقت گیا، بات گئی ڈیڈی۔" جارحانہ انداز میں فاخرہ بولی۔ "دشمن اگر ہوں گے تو آپ اور صلاح الدین ہوں گے۔ راحیل اور میں تو آپس میں دشمن نہیں۔ میں اسے بہت پسند کرتی ہوں۔ اس کا ایک سوشل اسٹیٹس ہے۔ سوسائٹی میں اس کی پہونچ ہے۔ وہ ہماری ٹکّر کا ہے۔ میں نے اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

بیرسٹر صاحب پیچھے ہاتھ باندھ کر پھر ٹہلنے لگے۔ غصّے اور طیش کے مارے وہ آگ ہو رہے تھے۔ کیا کریں اس خود سر اور گستاخ لڑکی کے ساتھ۔ مار ڈالیں جان سے۔ بلا سے۔ ان کی ناک تو نہ کٹے۔! ایسی ناب کار اولاد رہی کہ جہنم میں جائے۔

فاخرہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھا ڈیڈی۔ میں چلتی ہوں۔ بائے۔!"

"ٹھہر جاؤ۔!" وہ مڑ کر دھاڑے۔

"میری سہیلیاں میری منتظر ہیں!" فاخرہ جھنجھلا گئی۔ "آپ کو اپنے سوالوں کا جواب تو مل گیا۔ اب مجھے جانے دیجیے۔!"

"در اصل گردن زدنی میں ہوں۔ میں نے تمہیں سر چڑھا لیا ہے۔ اب تم سر سے اترنے پر تیار نہیں۔ خیر۔ میں اس کا توڑ بھی جانتا ہوں۔ فاخرہ کان کھول کر سن لو۔ تم نے جس مردود سے پینگیں بڑھائی ہیں۔ وہ میرا ازلی دشمن ہے۔ اور ایک دفعہ پھر مجھے زک دینے کے لیے اس نے یہ نیا حربہ اختیار کیا ہے۔ تم اس کے قبضے میں ہو گی تو وہ ہر طرح میری گردن جھکا سکے گا۔ تم اتنا نہیں سمجھتیں۔ کیا تمھیں میری اور اپنی عزت سے زیادہ اس کم بخت کا لحاظ ہے۔؟"

"میں کسی دشمنی کو نہیں مانتی ڈیڈی۔!" فاخرہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ "آپ مجھے اس قدر نا سمجھ اور نا عاقبت اندیش کیوں سمجھتے ہیں۔ ڈیڈی۔ پلیز۔ یقین کیجئے۔ راحیل نے آج تک آپ کی اور اپنے باپ کی دشمنی اور مقدمہ بازی کا تذکرہ تک نہیں کیا۔! وہ سب کچھ بھول

چکا ہے۔ پھر آپ ہی کیوں گڑے مُردے اکھیڑ رہے ہیں۔ آپ بھی بھول جائیے نا کیا آپ کو اپنی پوزیشن مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔؟"

بیرسٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔ گمان تک نہ تھا کہ وہ اس طرح مقابلہ پر آئے گی۔! کوئی دلیل کوئی عذر اس نے نہ مانا اور پھر غیظ و غضب سے بدحال ہو کر بیرسٹر صاحب نے کہا:

"جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ مگر سن لو۔ کہ تم اس صورت میں میری دولت کی ایک پائی کی بھی حصّہ دار نہیں رہو گی۔"

"اس وہم میں بھی نہ رہیئے گا۔ ڈیڈی۔" فاخرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بالغ ہوں۔ مجھے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کرنے کا حق ہے۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ قانونی طور پر آپ کو میرا حق دینا ہی پڑے گا۔ ایسے کتنے مقدمے آپ نے بھلا نہ لڑے ہوں گے؟"

یہ کہہ کر وہ بڑے طیش میں مڑی اور کمرے سے چل دی۔ بیرسٹر صاحب ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتے رہ گئے۔ بڑے شکست خوردہ سے تھے۔ بیک وقت ان پر غصہ اور تاسف نے ایک ساتھ حملہ کیا تھا۔ بڑی دیر تک وہ مفلوج سے ایک ہی جگہ کھڑے رہے۔!

ان کے دماغ میں انجن سے چل رہے تھے۔! غصہ تھا تو صرف اپنی بات کے گرنے کا۔ وہ نالائق چاہے دوزخ میں جاتی کہ بھاڑ میں۔ پھینک مارتے دو آنے بھر اس کا حصہ اس کے منھ پر۔ اور حصے کے بٹوارے کے ساتھ ہی ان کے تاریک ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔!

ٹھیک ہے۔ خود بخود راہ ہموار ہو رہی ہے۔ فاخرہ کو اس کا حصّہ

دے کر الگ کر دیں۔ بیگم کو خدا جدا کر رہا ہے۔ بس پھر آگے کا راستہ صاف اور منزل سامنے ہے۔ دل کو قدرے ڈھارس بندھی تو وہ صوفے پر آبیٹھے اور اپنی قانونی صلاحیتیں پوری طرح صرف کرنے کے بعد انہیں وہی فیصلہ عمدہ اور مناسب معلوم ہوا۔ جس قدر جلد ہو سکے فاخرہ کو علاحدہ کر دیں۔! انہیں اس سے محبت نہیں تھی۔ وہ تو اب اس سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ جلد سے جلد اس بدبخت کو سزا ملے۔ اچھا ہو جو راحیل کا بچہ جائداد ہضم کر کے اسے بھی پھٹکار کر گھر سے نکال دے۔ تب وہ بھی اسے سہارا نہ دیں گے۔!

وہ صوفہ سے اٹھ کر میز پر آبیٹھے اور بڑی قابلیت سے اپنے فیصلہ کا مسودہ تیار کرنے لگے۔!

فاخرہ کا موڈ قطعی بگڑ چکا تھا۔ وہ سہیلیوں میں واپس آئی اور ریکم د کاست تمام داستان ان سے کہہ دی۔ اب کئی زبانیں تھیں اور گوناگوں بولیاں۔ رائے مشورے۔

"ایسے خود غرض باپ کو تو سچ مچ سخت سزا دینی چاہیئے۔!"

"کیا نالایقی ہے۔ جناب اپنی دشمنی پر اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشیوں کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ لعنت ہے ایسے واہیات باپ پر۔!"

"اچھا کیا فاخرہ نے جو منھ توڑ جواب دے دیا۔"

"اے ہے۔ کون سی دس اولادیں ہیں۔ لے دے کے بس ایک لڑکی۔! توبہ۔ اتنی بھی کیا کنجوسی۔ کیا سارا سرمایہ چھاتی پر رکھ کے قبر میں لے جائیں گے!۔ آخر کو یہ سارا روپیہ پیسہ فاخرہ ہی کا تو ہے۔!"

"اب تو تم جلد سے جلد راحیل سے کورٹ میرج کر کے ڈیڈی کو شکست

دے دو۔ آخر وہ بھی تو منہ کی کھائیں۔"

"بھئی جوان اولاد سے باپ کی یہ سرکشی اور گستاخی اچھی نہیں لگتی۔"

فاخرہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ غصے کی زیادتی سے ہکلاتی ہوئی بولی:

"ارے۔ وہ۔ تو۔ کہہ ہی رہا تھا کہ بھائی یہ روز روز کا ملنا۔ رہ رہ کے ترسنا تڑپنا اچھا نہیں۔ مارو گولی جائداد کو۔ ہم مزے میں سول میرج کرلیں۔ مگر میں نے کہا کہ جب باپ مرا نہیں زندہ ہے تو اس سے پوچھ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ تو تماشہ سنو کہ باپ نے بیٹی کی خوشیوں پر مٹی ہی ڈال دی۔"

"دل چھوٹا نہ کرو۔ لعنت بھیجو ایسے ظالم اور سخت گیر باپ پر۔ تم آج ہی سول میرج کرلو۔ دکھا دو جناب بیرسٹر صاحب کو۔ وہ اپنا قانون گلاس میں گھول کر پی لیں۔ یہاں بھی قانونی ہی خون ہے۔! ہاری نہ مانے گا۔! ہاں اور کیا۔"

"وہ تو کرنا ہی ہے۔!" فاخرہ بولی۔ "مگر۔ وہ۔ ممی۔ ارے۔ وہ جو مہینوں سے بیمار پڑی ہیں۔ لعنت ہے۔ بے زار کرکے رکھ دیا انہوں نے بھی۔!"

"توبہ ہے۔ یہ بڑھے لوگ کہیں اپنی بیماری سے کہیں اپنی جہالت سے کیسے کیسے روڑے اٹکا دیتے ہیں ہماری اچھی بھلی راہوں میں۔"

"مگر ممی کی بیماری کا تمھاری شادی سے کیا تعلق ہے؟"

"کیا مطلب۔؟" فاخرہ چونک پڑی

"ممی تو خوش ہو جائیں گی۔ آخر انھیں تمھاری شادی کی فکر ہے کہ نہیں۔"

"بہت ۔ !" فاخرہ نے کہا۔

"تو پھر تم جلد از جلد شادی کر کے انہیں خوش خبری سنا دو۔ کیا پتہ کہ ان کی سانس تمہاری شادی کی فکر ہی میں اٹکی ہو۔ پھر اللہ چاہے گا تو ان کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ سنا ہے کہ کسی چیز میں دم اٹکا ہو تو۔ مطلب یہ کہ ۔ !"

"ٹھیک تو ہے۔ مگر ڈیڈی راحیل کو گھر میں گھسنے دیں گے ؟" فاخرہ نے تشویش سے پوچھا۔

"مجال ہے نہ گھسنے دیں۔ بس یہی تو تمہاری کمزوری ہے فاخرہ۔ خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔ ارے تم زبردستی گھسا لانا۔ آخر ممی بھی اپنے داماد کو دیکھیں گی نا۔ ! اور یہ تمہارے ڈیڈی۔ وہ بھی۔ پگھل جائیں گے۔ دیکھ لینا۔ کیا انہیں اندیشہ نہ ہو گا کہ مقدمہ باز سمدھی اپنے بیٹے کی توہین پر پھر کوئی مقدمہ نہ بنا دے گا۔"

"کہتی تو سچ ہو۔ دراصل قانون داں کی بیٹی تم ہی کو ہونا تھا۔" فاخرہ ہنس کر بولی۔ مشورہ دینے والی صاحب زادی بھی ہنس دیں۔

"معاف کرو۔ میں اپنے پروفیسر باپ کی بیٹی ہونے پر مغرور ہوں۔ سچ۔ پاپا مجھے دیکھتے ہیں کہ اپنے کلاس فیلو قریشی کے ساتھ ہر جگہ ہر وقت گھومتی پھرتی ہوں مجال ہے کچھ بول تو دیں۔ سمجھتے ہیں نا کہ اب وقت اور زمانہ ہمارا ہے۔"

"ارے اب چلو بھئی۔ خاصی دیر ہو چکی ہے۔ !"

"ہاں ہاں چلو۔ وہاں ہم سب کے فرینڈز کافی بور ہو رہی ہوں گے۔" فاخرہ نے لباس بدلا۔ سب نے تھوڑا بہت میک اپ تازہ کیا اور

اپنے اپنے پرس سنبھال کر کمرے سے نکل گئیں۔

کریمی صاحب کا خیال تھا کہ ان کے ہم سائے شبیر صاحب ان کی کہی ہوئی قیمت پر اُن کا زیر تعمیر مکان خرید لیں گے۔ اب تک تیس ہزار سے زائد اس پر خرچ ہو چکے ہیں۔ لیکن شبیر صاحب نے بیس ہزار سے کوڑی زائد نہ کی۔ ! سالہا سال سے پڑوسی رہ رہے تھے۔ ہر وقت کا آنا جانا خوشی غمی میں برابر ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔ لیکن روپے پیسے کا معاملہ آپڑا۔ تب انہوں نے خاصے طوطے کی طرح دیدے پھیر لیے۔ کریمی صاحب دس ہزار سے زیادہ نقصان برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا معاملہ پھر التوا میں رہ گیا۔

وہ اٹھ کر چلے گئے۔ کریمی صاحب دل تھام کر آہیں بھرنے لگے۔ ! بڑا سہارا ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ !

بیوی کو اگر موہوم سی خوشی تھی کہ مکان ہاتھ سے نہ گیا تو رنج بھی تھا اب شوہر کے معقول علاج کا کیا ہوگا۔ !

دونوں گم صم تھے۔ پاس بچّے بھی آبیٹھے تھے۔ ان کے چہروں سے بھی حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ ! ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ والدین کو کون سے الفاظ میں تسلّیاں دیں۔ رہ رہ کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور سر جھکا لیتے تھے۔ !

دفعتاً دروازے پر کار کا وہ ہارن گونجا جسے کریمی صاحب اچھی طرح پہچان گئے تھے! ۔ ان کا پژمردہ چہرہ کِھل اٹھا۔ بے ساختہ بولے:

"وہ آگئے۔ رحمت کا فرشتہ بن کر۔ بیگم تم اور عافیہ اندر چلی جاؤ۔"

نجانے کیا بات تھی کہ بیگم صاحبہ کو شوہر کے اس پرانے رفیق سے للّٰہی بغض تھا۔ مگر وہ کچھ بولتی نہیں تھیں۔ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے عافیہ بھی اٹھ گئی۔ کریمی صاحب نے حمزہ کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور بیرسٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے آیا۔

دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ حمزہ چاہتا تھا کہ ان کی گفتگو سنے۔ مگر کریمی صاحب نے اسے گھورا اور سخت لہجے میں بولے:

"جاؤ۔ چائے لے آؤ۔ !"

ظاہر تھا وہ اسے بھگانا چاہتے تھے۔ حمزہ کو ناگوار تو ہوا۔ مگر وہ اس کے بعد وہاں نہیں رکا۔ گھر میں آکے چائے کے باہر بھجوانے کی تاکید کر دی اور اپنی کتابیں لے کر دوست کے پاس چلا گیا۔ !

عافیہ پردے کے پاس ہی رک گئی تھی۔ اس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اُسے بس یوں ہی سا شبہہ ہوا تھا کہ یہ موٹی اور گونجدار آواز اس نے کہیں سُنی تھی۔ اپنا شک مٹانے کے لیے اس نے درانہ سے آنکھ چپکا دی۔ اور فوراً ہی ہٹا بھی لی۔ اسے سخت حیرت تھی ! ۔

اس نے ان بیرسٹر صاحب کو ڈاکٹر دانش کے کلینک میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک انہیں بھولی نہ تھی۔ ان کا بھاری بھرکم ڈیل ڈول، ظاہری شان و شوکت، اور بے حد بھاری آواز ابھی تک اسے یاد تھی جیسے کوئی عجیب الخلقت

چیز عرصہ تک آدمی کے ذہن سے چپکی رہتی ہے۔ اسی طرح لاشعوری طور پر یہ مرعوب کن شخصیت بھی اس کے ذہن سے چپک گئی تھی۔ اور اس وقت اپنے گھر میں اپنے باپ سے انہیں اس قدر قریب دیکھ کر عافیہ حیرت و تعجب سے گنگ رہ گئی۔ یہ اباجان کے بہت پرانے دوست تھے تو پھر اب تک کہاں تھے؟ وہ سوچا کی۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ ان دونوں کی باتیں سنے۔ آخر اس کے معذور و محتاج باپ میں ایسی کون سی کشش تھی جو بیرسٹر صاحب بھاگ بھاگ کے آتے تھے اور گھنٹوں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ مگر اسے ماں نے آواز دی۔ اور اسے وہاں سے ہٹنا پڑا۔

علیک سلیک کے بعد پہلا فقرہ کریمی صاحب کے منھ سے یہی نکلا:

"آپ کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ حضرت راضی نہیں ہوئے۔ کس کے قول و فعل پر اعتبار کیا جائے عباد بھائی۔!"

"جناب۔!" بیرسٹر صاحب نے قہقہہ لگاکر کسی شاعر کے انداز میں انھیں سلام کیا۔ "میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ یہ معاملہ پٹنے والا نہیں ہے آپ ہی کو ان صاحب پر بھروسہ تھا۔ کیا کہا انہوں نے؟"

"تیس ہزار ان کے پاس نہیں ہیں۔"

"ماریئے گولی۔ نہ ہوں گے ان کے پاس۔ میرے پاس تو ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

مطلب یہ کہ تیس ہزار کو جھونکیے جہنم میں۔ آپ اس مکان کی تعمیر کی اجازت مجھے دے دیجیے۔ بس یہ سمجھیے کہ مکان بن گیا۔ جدید ترین ضروریات سے آراستہ ہو گیا اور آپ اس میں منتقل ہو گئے۔!"

"الہ دین کا چراغ مل گیا ہے مجھے۔" کمزور سا قہقہہ کریمی صاحب نے بھی لگایا۔

"یہی تو مصیبت ہے کہ آپ کو اوروں غیروں پر اعتبار ہے۔ مجھ پر نہیں۔" بیرسٹر صاحب بولے۔ "میں آخر کیوں آپ کے پاس دوڑ دوڑ کے آتا ہوں۔ کیوں مجھے آپ کی اتنی فکر ہے۔ کیوں میں ساری ساری رات آپ کے متعلق سوچتا ہوں۔ بس اسی لیے نا مجھے آپ سے محبت ہے۔ اور میں نے اپنے چار جوان بھائیوں کو خدا کے سپرد کر کے، آپ کو پایا ہے۔ آپ کے احسانات بھی مجھے یاد ہیں۔ ان احسانوں کا کوئی بدلہ تو نہیں ہو سکتا۔ مگر میں اس کا عشر عشیر تو آخر کر ہی سکتا ہوں۔ تو پھر کیوں نہ کروں؟"

"مجھے بھی تو معلوم ہو۔ آخر کرنا کیا چاہتے ہیں آپ؟" کریمی صاحب متحیر تھے۔

"بس آپ کی تمام تمناؤں کو تکمیل کا روپ دینا چاہتا ہوں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "کل ڈاکٹر بھٹناگر سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس مرض کے ماہر معالج ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ فوراً مریض کو ہسپتال لے آئیے وہاں بہترین طبی امداد ملے گی۔ عمدہ سہولتیں نصیب ہوں گی۔ اور ——!"

"بھائی۔ میاں۔ میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ——!"

"پھر وہی مغائرانہ تکلف۔" بیرسٹر صاحب نے بات کاٹ دی۔ "تم نے بھابی سے مشورہ کیا؟"

"کیا تھا ——!"

"کیا کہا؟ ——"

" وہ تو راضی ہیں ۔!"

" تو پھر دیر کس بات کی ہے ۔ اٹھو اور چلو ۔ !"

" کاش ! اٹھ کر چل سکتا !" کریمی صاحب نے ٹھنڈی سانس لی

" اچھا ۔ ہاں ۔ ایک بات تو یاد ہی نہ آئی ۔ برا نہ مانو تو کہوں ۔!"

" کون سی ایسی بات ہے ۔ جس سے میرے برا ماننے کا خوف ہے ؟"

ہچکچا کر بیرسٹر صاحب نے پوچھا :

" تمہاری ملازمت تو اب رہی نہیں ۔ تو پھر ۔ گھر کا خرچ ۔ مطلب یہ کہ ۔ !" وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئے ۔

" کھانا پینا تو کبھی کسی کا رکتا تو نہیں نا !" کریمی صاحب نے جواب دیا ۔

" ناصر بھائی ۔ تمہیں خدا کا واسطہ ۔ ! تکلف مت کرو ۔ مجھے اپنی خدمت کا موقعہ دو ۔ میں نے تمہاری تمام ذمہ داریاں سنبھالنے کی قسم کھائی ہے ۔"

" آخر تم کہاں تک اور کب تک میرے پیچھے برباد ہو گے ۔ اور پھر میری غیرت کا بھی تو کچھ تقاضا ہے ۔ میں کس طرح تم کو مسلسل زیر بار ۔ !"

" میرا خاندان ہی کتنا بڑا ہے ۔" بیرسٹر صاحب بولے پھر یک بارگی آب دیدہ ہو گئے ۔ " ایک معصوم سی بے زبان بچی ۔ دوسری بستر مرگ پر پڑی ہوئی جاں بلب بیوی ۔ ایک غم زدہ دکھی پریشان میری ہستی ۔ ! آخر ہم تین نفوس کیا کھائیں گے ۔ کتنا خرچ کریں گے اللہ نے جب فراغت دی ہے تو اس میں اوروں کو بھی حصہ ملنا چاہیے ۔ اور دل میں تم سب کے سوا میرا ہے ہی کون ۔ اگر تم نے میرے خلوص کی پذیرائی نہ کی تو سچ کہتا ہوں کہ اپنا شرمندہ چہرہ چھپا لوں گا پھر کبھی ملنے نہ آؤں گا ۔ جب تمہیں

گونجی گی۔ عافیہ گم صم سی کھڑی تھی! حمزہ ابھی تک واپس نہ آیا تھا باہر بیرسٹر صاحب بیٹھے تھے۔ ان کا ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اور خود بیرسٹر صاحب نے کریمی صاحب کو بستر سے کار میں منتقل کیا! بڑے آرام سے انھیں پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔!

شوفر نے اپنی سیٹ سنبھالی۔

بیگم اور عافیہ دروازے تک چلی آئی تھیں۔ عافیہ بدحواس سی دیکھ رہی تھی۔ اسے پردے وردے کا ہوش نہ تھا۔! دفعتہً بیرسٹر صاحب پلٹ کر دروازے تک آگئے۔ اس کی اور ان کی نگاہیں مل گئیں۔ نجانے کیا بات تھی ان کی آنکھوں میں۔ عافیہ دم بخود سی رہ گئی! وہ نظریں جھکا بھی نہ سکی۔ بیرسٹر صاحب نے گلا صاف کر کے کہا:

"فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال ضرور آنا۔ وہاں ملیں گے۔!۔" اور پھر کار کی طرف چلے گئے۔!۔ کار کب گئی۔ عافیہ کو پتہ نہ چلا۔ وہ ابھی تک خالی سڑک کو تکے جا رہی تھی۔!

پھر وہ ماں کی سسکیوں سے چونکی۔!

"امی۔؟۔"

"پتہ نہیں۔ دل کیوں اس طرح دھڑک رہا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔"

"ابا جان کے اس طرح جانے کا اثر ہے۔ امی۔ آپ دل مضبوط رکھئے۔ اللہ نے چاہا تو ابا جان کا اب صحیح علاج ہوگا۔ وہ اچھے ہو جائیں گے!"

بڑے بوجھل دل لیے وہ ہسپتال گئے تھے۔ پتہ نہیں کیا دیکھنا
پڑے۔ مگر دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ نہایت آرام سے کریمی صاحب
اپنے بستر پر دراز تھے۔ اور بہت مسرور و مطمئن دکھائی دے رہے تھے
انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو الٹی تسلی دی اور کہا کہ اس ماحول میں
وہ نہایت مطمئن ہیں۔ چنانچہ بیوی اور بچے بھی مطمئن ہو گئے۔ حمزہ
کا کھنچا ہوا منھ درست ہوا۔ عافیہ نے سکھ کی سانس لی۔!

ابھی ان سب کے رخصت ہونے میں بہت وقت تھا۔ ادھر ادھر
کی باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً پارٹیشن کے پیچھے سے بیرسٹر صاحب نمودار
ہوئے۔ وہ بھی کریمی صاحب سے ملنے آئے تھے۔ اب بھلا یہاں پردہ
وردہ کہاں تھا۔ لہذا بیگم صاحبہ کا اور بیرسٹر صاحب کا بھرپور
سامنا ہوا۔ جب تک وہ بوکھلا کر برقع کا نقاب گرائیں بیرسٹر صاحب
نوعمر لڑکے کی طرح جھک کر بیگم صاحبہ کو مؤدبانہ سلام کر چکے تھے۔ دل
ہی دل میں سخت ندامت محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بھی سلام کا
جواب دیا۔

طوعاً و کرہاً عافیہ اور حمزہ کو بھی آداب و تسلیمات بجا لانی پڑی۔
مسکراہٹ بیرسٹر صاحب کے چہرے سے جدا ہوتی ہی نہ تھی۔ !وہ
تپائی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اور نہایت شگفتہ لہجہ میں بولے:
"میں نے اچھا کیا نا بھابی۔ ان حضرت کی نہیں نہیں ایک نہیں سنی
انہوں نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا۔ عافیہ بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ خوشنما
فیروزے رنگ کے ہلکے پھلکے لباس میں اس کا گلابی سا چہرہ دمک

رہا تھا۔ سیاہ دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔! اور مرکیری بلب کی تیز دودھیا روشنی میں وہ خلاف معمول بے حد حسین ہو رہی تھی!

بیرسٹر صاحب کے دل میں آتشبازی سی چھوٹنے لگی۔ اب کیا ہے۔ یہ روز صبح و شام اپنے باپ سے ملنے آیا کرے گی۔ اکیلی۔ ہمیشہ ماں یا بھائی دم چھلا بنے ساتھ ساتھ تو آئیں گے نہیں۔ بس، رفتہ رفتہ کھل جائے گی دو چار ملاقاتوں میں۔ میں اس کے باپ پر آخر یہ مفت کے احسان کیوں کر رہا ہوں۔ کہیں سے کرید کر پرانی کلاسوں کا یارانہ نکالا۔ حالانکہ کریمی صاحب کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں ہے کہ بیرسٹر صاحب نے شروع سے اخیر تک حیدر آباد کے کسی بھی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ پوری تعلیم پا کے قسمت آزمائی کے لیے کہیں شمالی ہند سے جنوبی ہند آئے تھے۔ لیکن جھوٹ بولنا ہی ٹھہرا تو چھٹانک بھر کیا اور من بھر کیا۔ کریمی صاحب کو انہوں نے شیشے میں اتار ہی لیا تھا۔ جلد بازی کام شیطان کا۔ تر لقمہ پھونک کر کھانا چاہئے۔ مطلب بھی نکل آئے اور کسی کو شبہ بھی نہ ہو۔

انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔!

اور اب وہ ہنس رہے تھے۔ ہنسا رہے تھے۔ عافیہ سے تو وہ براہ راست مخاطب بھی نہیں ہوئے۔ نہ ایک مرتبہ بھی اس کی طرف دیکھا۔ بس وہ اپنی بھابی سے باتیں کئے گئے۔ حمزہ سے اس کی تعلیم اور آئندہ کے پروگرام پر گفتگو کرتے رہے۔ مریض کے دل کو بہلانے کے لیے لطیفے اور اشعار سنائے پھر یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ میں

کرنل صاحب سے مل کر آتا ہوں۔

وہ سب بے حد متاثر تھے۔!

" دوست ہو تو ایسا ہو۔ بے غرض، بے نفس، بے لوث۔"

کریمی صاحب کے منہ سے نکلا پھر وہ آہستہ سے بولے:

" تم سے کہنے کا موقعہ نہ ملا۔ سنو۔ رات کو بیرسٹر صاحب نے میرے ہزار انکار پر بھی زبردستی یہ پانچ ہزار روپے دیئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ بیوی کو مت بتانا۔ تم خرچ کرو۔ بھلا بتاؤ۔ احسانوں کے اس بھاری بوجھ کا بوجھ میں کیسے سنبھال سکوں گا۔"

فوراً بیوی نے کہا:

" آپ ان کے روپے واپس کر دیجئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے وہ اپنے روپے کا مول ضرور طلب کریں گے۔ بے وجہ وہ آپ پر کیوں اتنے مہربان ہو گئے ہیں۔ وہ وکیل ہیں۔ ہزاروں چھل فریب مکاریاں انہیں معلوم ہوں گی۔ قانونی شکنجے میں کسی بے خبر آدمی کو کس طرح جکڑا جاتا ہے۔ یہ بھی انہیں پتہ ہو گا۔ آپ دور تک نہیں سوچتے۔ یقیناً اس میں ان کی کوئی چال ہے۔ ابھی سویرا ہے۔ ان کے روپے بھی دیجئے اور آپ بھی گھر چلئے۔ موت زندگی، اچھا برا سب پروردگار کے ہاتھ ہے۔ ہم ان کے ہاتھ سے دکھ کیوں گے کر کیوں مریں۔ ؟ ۔"

عافیہ خوف زدہ نگاہوں سے انہیں تک رہی تھی۔ حمزہ نے بھی برا سا منہ بنا کر کہا تھا بولا:

" میں بھی تو امی یہی کہہ رہا تھا کہ یہ چکے چار سو بیس معلوم ہوتے ہیں

کہا ان کا لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ پھر کسی کو انکار نہ ہو سکا۔

راستہ بھر کوئی کسی سے کچھ نہ بولا۔ بیرسٹر صاحب ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے۔ عافیہ کی ناقدانہ نظریں ان کی پشت پر گڑی تھیں۔ اور وہ سوچ رہی تھی اس دیو کے دلیو نے دانش کے دل کو کس قدر صدمہ پہونچایا تھا۔ وہ تو اسی رات کو آئے تھے۔ اور دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ شوخی اور بذلہ سنجی کا دُور دور پتہ نہ تھا۔ رہ رہ کر وہ ہونٹ دانتوں سے کچلتے رہے تھے۔ اور اتنی بے چینی سے اپنے بال مٹھی میں بھرتے جیسے وہ الجھن جو دماغ میں ہل چل برپا کر رہی تھی اسے باہر نکال پھینکنا چاہتے ہوں۔ عافیہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس کے والد نے ان کا علاج نہ کروایا تو اس میں دانش کی بے قراری کی کیا بات تھی۔ کیا ہو گیا تھا انہیں۔ اس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ ان سے ضرور ملے گی چاہے گھر میں کوئی سا لنگڑا بہانہ بنانا پڑے۔

انھیں گھر پر ڈراپ کر کے بیرسٹر صاحب چلے گئے۔

اب ان لوگوں کو کرنے کے لیے کوئی ضروری کام نہ رہ گیا تھا۔ حمزہ بدستور اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ بیگم اندر جا لیٹیں اور اکیلی عافیہ برآمدے میں بیٹھی سوچا کی۔ آج اس کا دل بھی سخت اداس تھا نجانے آنے والے برے دن اس پر اپنا عکس ڈال رہے تھے یا کوئی اور بات تھی۔ رات کا کھانا بھی اس سے کھایا نہ گیا۔ وہ اپنے بستر پر آلیٹی۔ کچھ دیر ماں کو دکھانے کے لیے کتاب پڑھتی رہی۔ نظریں سطروں پر تھیں اور ذہن کوئی بہانہ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بڑے غیر اہم لہجے میں بولی:

"کل کالج میں ایک فنکشن ہے۔ امی۔ میری واپسی میں دیر لگے گی۔ آپ گھبرا نہ جائیے گا۔ !" پھر اس نے چور نظروں سے انہیں دیکھا۔ "آپ کہیے تو جاؤں ورنہ نہیں۔ !"

"کب تک واپس آؤ گی۔ ؟"

"گھنٹہ آدھا گھنٹہ دیر تو ہو گی ہی۔" جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔

اچھا ہے فنکشن دیکھ لو۔ تم بھی تو بہت گھبراتی رہتی ہو۔ جی لگنے کا غارت گیا سامان ہی ہمارے پاس کیا رہ گیا ہے۔ مٹی پڑ گئی تقدیر پر۔ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک وقت ایسا مجبوری کا بھی آئے گا۔ اب خیرات کھانی پڑے گی۔ میرا تو جی متلاتا ہے۔ ۔ ۔"

عافیہ چپ رہی۔ کچھ دیر تک قسمت کا گلا کرنے کے بعد بیگم بھی سو گئیں۔

بالآخر فاخرہ نے اپنی مرضی پوری کر لی۔ ایک صبح دونوں نے کورٹ میرج کر لی اور رجسٹرار آفس سے نکل کر اپنے ہوٹل چلے گئے۔ ! نہ فاخرہ نے اپنے گھر جانا پسند کیا نہ راحیل کو یہ منظور تھا کہ وہ اس کے گھر جائے۔ !

اب وہ شہر کے نہایت عالی شان ہوٹل راجدھانی کی چوتھی منزل پر ایک سجے سجائے کمرے میں تھے۔ ایک روز پہلے ہی سے فاخرہ کی ایماء پر

"اچھا۔!" وہ ہنس دی۔

"اب ہمیں ایک عمدہ سا گھر بھی لے لینا چاہیے۔ ہفتہ عشرہ بعد واپس آئیں گے تو کہاں رہیں گے ۔ ؟" راحیل بولا۔ دونوں کھانے کے بعد بالکونی میں آکھڑے ہوئے تھے۔

تمہارے ڈیڈی کے تو بہت سے مکان اور خوب صورت کوٹھیاں ہیں!

ہیں تو۔ مگر وہ دینے کیوں لگے ؟" راحیل منہ بنا کر بولا۔

"کیوں ؟" فاخرہ کو اس کا جواب اچھا نہ لگا۔

"ان کی پسند اور مرضی سے میں نے شادی نہیں کی نا۔ اس لیے دراصل ڈیڈی اپنے بھائی کی لڑکی کا مسئلہ میرے سامنے رکھ چکے تھے۔ میں نے ان کا پروپوزل قطعی ریجکٹ کر دیا۔ اس کا غصہ ہے انھیں۔!"

"فکر نہ کرو۔ آئی وِل پرچیز۔" فاخرہ نے کہا۔ "یہ دیکھو۔ اس میں کیا نہیں آسکتا۔" اس نے پرس کھولا اور اپنا بیمہ شدہ کاغذ راحیل کو دیدیا۔

"تمہارا حصہ دیدیا بیرسٹر صاحب نے۔ ؟" آنکھیں نکال کر راحیل نے پوچھا۔ جواب میں فاخرہ نے گردن اکڑائی۔ "دے نہیں دیا۔ میں نے لے لیا۔"

"اتنی عجلت کیوں کی ؟" راحیل نے کہا۔ اسے فاخرہ کے نام کے صرف پندرہ لاکھ بہت کم لگ رہے تھے۔ "تھوڑا انتظار اور کرنا تھا ڈارلنگ۔ آخر تمہارے باپ کی دولت کی وارث ساری کی ساری تم ہی تو ہو۔ باقی سرمایہ کیا ہوگا۔ تم گھاٹے میں رہ گئیں۔ اونلی پندرہ لاکھ۔

ہو پ لیں۔"

"یہ بھی نہ ملتا۔ اور مجھے جلدی تھی۔ سمجھے۔" فاخرہ بولی۔
"ڈر لگا تھا کہ تم کہیں اپنے وعدے سے پھر نہ جاؤ۔ اور اِدھر میری جان سولی پر تھی۔ جانتے ہو۔ ایک بڑی اہم بات میں نے تمہیں نہیں بتائی
"وہ کیا۔" بے خیالی میں دستاویز اپنی جیب میں رکھ کر راحیل اس کی طرف گھوما۔ اور مستفسرانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔!
"بوجھو بھلا کون سی بات ہو سکتی ہے۔؟" فاخرہ اٹھلائی اور اس کے بازو سے لگ گئی۔
راحیل نے اپنی کنپٹی انگلی سے بجائی۔ اور پھر ہار جانے والی نظروں سے فاخرہ کو دیکھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "ہار گئے؟—"
"ہاں—!" وہ بھی ہنسنے لگا۔!
"سوچو۔ جلدی مجھے کس بات کی ہو سکتی تھی۔؟" فاخرہ نے کہا۔
"تم میری بے خواب راتوں، بے تاب دنوں پر رحم کرنا چاہتی تھیں۔"
"جی نہیں۔" فاخرہ نے ان کی ٹائی دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر کہا۔ "اس لیے کہ میں تمہیں جلد سے جلد اپنے ہونے والے بچے کے باپ کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ ڈھائی تین مہینے میں نے کتنے کرب سے کاٹے ہیں، تمھیں کیا معلوم۔"
"واقعی۔؟" جلدی سے اس نے فاخرہ کے ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"بے صبرے۔ نڈیرے۔ کنگلے۔" فاخرہ نے بڑی ناز بھری ادا سے

دانت پیسے ۔

" مگر یار ۔ ابھی تو ہنی مون بھی نہیں ہوا ۔ اور بچہ ۔ ؟ "

" ہنی مون کون سا برس با برس ہوتا رہے گا ۔ چند روز ادھر ادھر گھوم پھر کے چلے آئیں گے ۔ پھر ایک چھوٹا سا عمدہ گھر خرید یں گے ۔ ہمارا مُنّا ہو گا اور ہم ہوں گے ۔ ! "

" شیور ۔ شیور ۔ اچھا اب چلو چلیں ۔ " راحیل نے کہا ۔ " تم نے تو یار باپ بن جانے کی نوید دے کر نئی نویلی شادی کا مزہ ہی کرکرا کر دیا اب تو تمہیں کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھنا پڑے گا ۔ ! "

" اور پھر کیا ۔ تجھے پتھر پر بٹھنا چاہتے تھے ۔ ؟ " فاخرہ نے تیوری بدلی ۔ " یہ بات پہلے ہی نہ سوچ لی تھی ۔ ! "

وہ اس طرح گھومنے نکل کھڑے ہوئے جیسے پہلی بار اس شہر میں آئے ہوں ۔ فاخرہ کو گفتگو کے درمیان اپنی دستاویز لینے کا خیال نہ آیا ۔ اور نہ راحیل ہی نے اسے واپس کی ۔ فاخرہ نے یہ بھی محسوس نہ کیا کہ بچے کی خوش خبری سنتے ہی راحیل کے چہرے کی تازگی، شگفتگی اور مسرت ایک سنگین سی بیزاری اور اکتاہٹ میں بدل چکی تھی ۔ اب وہ طوعاً کرہاً اس کا ساتھ دے رہا تھا ۔ اس قدر جلد اس کی قلب ماہیت ہوئی تھی ۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ فاخرہ نے سچ مچ اسے بیوقوف بنایا تھا ۔ ! وکیل کی بیٹی نے نجانے کس کی غلاظت اس کے سر منڈھنے کے لیے اسے بدھو بنا دیا تھا ۔ وہ تو اس کے سامنے کلب میں انجانے مردوں سے ملتی اور ان کی تفریح کا سامان بہم پہنچاتی تھی ۔ راحیل

کے پاس کوئی ثبوت ہی نہ تھا کہ فاخرہ کا بچہ درحقیقت اس کا بھی بچہ ہے.

لیکن اس نے اپنے کسی اندیشے کا اظہار نہیں کیا ۔ ڈرتا تھا کسی قانونی گرفت میں نہ آجائے ۔ اس نے سوچا ۔ بڑی خوبصورتی سے اپنی گلو خلاصی کی تدبیر سوچنی چاہیے ۔!

دوسرے روز وہ شملہ چلے گئے ۔!

جس دن فاخرہ گھر سے نکلی ہے ۔ بیگم صاحبہ بس آخری سانسوں پر ہو رہی تھیں ۔ ان کے پاس کئی ڈاکٹر تھے ۔ بیرسٹر صاحب پلنگ کے پاس غم گین سے بیٹھے تھے ۔ ملازم تک پریشان صورت بنائے دیوار سے لگے کھڑے تھے ۔ ان میں فاخرہ نہیں تھی ۔ بیگم صاحبہ کو طویل بیہوشی سے جب بھی تھوڑے وقفہ کے لیے ہوش آتا وہ بے حد بے قراری سے کمرے میں موجود افراد پر نظریں دوڑاتیں اور کپکپاتے لہجے میں فاخرہ کو پوچھتیں ۔ فاخرہ کہاں تھی جو آتی ۔ باپ بیٹی میں جو جنگ زرگری ہوئی تھی، اس سے یہ بے چاری لاعلم تھیں ۔ بیٹی، جاں بلب ماں سے آخری دفعہ مل کر بھی نہیں گئی ۔ ساری رات وہ بے چاری نزع میں فاخرہ کو پکارتی رہیں ۔ اور صبح کے قریب سسکتے سسکتے دم توڑ دیا ۔

بیرسٹر صاحب نے اس لمحہ کی آرزو میں اپنا بہت سا خون جلایا تھا ۔ مگر اب جب کہ بیوی کی لاش ان کے سامنے پڑی تھی ۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بے آب و گیاہ تپتے ہوئے صحرا میں کھڑے ہوں ۔ بہت سے پچھتاووں نے ایک ساتھ ان پر یلغار کی تھی ۔ وہ تھوڑی سی دیر کے لیے ان سے مغلوب بھی ہوئے تھے ۔

لیکن یہ ویسی ہی ندامت تھی جیسے کہ وہ بڑے سے بڑے جھوٹے مقدمہ کو اپنے زورِ کمال سے خالص سچا ثابت کر کے اپنے موکل کو کامیاب کر دیتے تھے۔ اور بعد کو ذرا سی دیر پچھتانے کے بعد پھر اصلی حالت پر آجاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اب بھی خود کو تسلی دے لی۔ بیگم کو تو ایک روز مرنا تھا ہی۔ بے چاری اتنا بڑا دل اتنے موٹے بدن میں کب تک لئے رہتیں۔ اور پھر اپنے خادم خاص کو آخری رسومات کی انجام دہی کا حکم دے کر اپنے کمرے میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بے شک بو کھلائے سے رہے۔ اور پھر نئی آرزوؤں کا صنم خانہ سجانے لگے۔!

ظہر کے وقت تک بیگم صاحبہ کا نام ہی نام رہ گیا۔ ان کے آثار رہ گئے اور وہ خود شہر خموشاں میں جا بسیں! شام تک نرسیں اور ملازم عورتیں بھی رخصت ہو گئیں۔

ہفتہ عشرہ میں انہوں نے بے گنتی ملازموں کو بھی نکال دیا۔ کمروں میں قفل پڑے ایک لق و دق کوٹھی میں یہاں وہاں اُلّو بولنے لگے!

اب صرف خانساماں، اور لڑکا رہ گئے تھے۔ اور بس۔!

تھوڑے دنوں کے دکھاوے کے سوگ اور بناوٹی غم کے بعد وہ دل ہی دل میں خوش رہنے لگے۔ بیوی گئیں، بیٹی کا کھٹکا دل سے نکلا۔! اب راستہ صاف، منزل سامنے تھی۔ لیکن بڑا پیچیدہ سوال اپنی آرزو کے اظہار کا تھا۔ عرض مدّعا۔ بڑا جوکھم کا کام تھا۔ ان کے منہ سے ایک حیران کن بات سن کر کریمی صاحب پر کیا ردِّ عمل ہو گا؟ کیا کہیں گے وہ۔ کیا سوچیں گے۔؟ — اور وہ کریمی صاحب کے بارے

میں خود ہی سوال و جواب کرتے خاصے الجھ کر رہ جاتے۔ پھر انہیں خیال آتا کہ اب تک انہوں نے کریمی صاحب پر بے انتہا احسان کیئے تھے۔

ان کا علاج معالجہ، نقد رقم سے مدد۔ گھر کی تعمیر۔ ان کا مکان بڑی تیزی سے بن رہا تھا۔ اگرچہ کریمی صاحب نے اس سلسلے میں بے انتہا مخالفت کی تھی۔ بیگم صاحبہ نے قسمیں دے دے کر منع کیا تھا۔ مگر بیرسٹر صاحب نے کسی کی ایک نہ سنی تھی۔ اپنا ناطق فیصلہ سنا دیا تھا کہ مکان بن کر رہے گا۔ اور وہ نہایت شان سے بننے لگا تھا۔ نچلی منزل تو تقریباً مکمل ہو رہی تھی۔ اوپری منزل پر ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ تو یہ سب کچھ بیرسٹر صاحب نے ازراہ خدا ترسی اور بندہ پروری تو کیا نہ تھا۔ اگر وہ اپنے بے حد و حساب خلوص کا معاوضہ چاہتے تو حق و انصاف پر تھے۔ اپنے پیشہ کے لحاظ سے وہ برسوں سے حق اور انصاف کے راستے پر گامزن تھے۔

وہ اس عرصے میں کریمی صاحب سے نہیں ملے۔ حالانکہ وہ بڑی بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ ایک دفعہ حمزہ کسی سے معلوم کر کے بس یہ خبر لایا تھا کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر کریمی صاحب نے کچھ باور نہ کیا۔ خدا خدا کر کے کوئی پندرہ دن بعد بیرسٹر صاحب نے صورت دکھائی۔ جان بوجھ کر نہایت یتیم شکل بنا رکھی تھی جس کا اثر خاطر خواہ کریمی صاحب پر ہو گیا۔ ! فی الفور آنسو بہانے میں بیرسٹر صاحب ماہر تھے۔ چنانچہ جب اپنی بے سروسامانی کا تذکرہ کرتے

اتار چکے تھے۔ اور میز کی درازیں مقفل کر رہے تھے۔

عافیہ کو خلاف توقع دیکھ کر وہ متعجب رہ گئے۔!

"خیریت۔؟" ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے پپڑی بندھے ہونٹوں پر ابھری۔

دفعتہً عافیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"

کیوں۔ کیا بات ہے؟۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔ اور لپک کر دروازے پر پردہ برابر کرنے لگے۔!

تم رو رہی ہو۔ عافیہ۔! چچا صاحب تو اچھے ہیں؟" وہ پاس آئے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ان کے ہاتھوں کی تپش سے مایوسی، غم، اور کوفت کے بادل آنسو بن کر اس کے پژمردہ رخساروں پر بہہ نکلے۔!

"خدا کے واسطے۔ بتاؤ۔ کیا ہوا۔؟" دانش کا اضطراب ترقی پر تھا۔ انہوں نے اسے کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا اور خود تپائی سرکا کر اس کے سامنے ٹک گئے۔!

"اچھا تو رومال سنبھالو۔ میں بھی اسٹارٹ لینے والا ہوں۔"

"آپ کیوں روئیے گا۔ آنسو تو آپ نے میرے نصیب میں لکھ دیئے۔" وہ خاصی خفگی سے بولی۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔!

"خدا سے ڈرو۔ تم تو کفر بک رہی ہو۔" وہ ہنس کر بولے۔

"میں تو بکواس ہی کرتی ہوں۔"

"بھائی تمھارا نصیب لکھا ہے اللہ میاں نے۔ خاص سنہرے قلم سے۔ سمجھیں۔ اب تم پوچھو مجھے اس کا پتہ کیسے چلا۔ پوچھونا۔!"

"نہیں پوچھوں گی !۔" وہ بھی ان کے لہجے سے ہنس دی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دانش پیار سے بولے۔" تم نے یکبارگی رو دھو کر میرا دل بھی دھڑکا دیا تھا۔ اب بتاؤ۔ اچھے بچوں کی طرح کیا بات ہے ؟۔"

"آپ مجھ سے ملے کیوں نہیں۔ کیوں مجھ سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ؟"

"کون ؟۔ میں۔ ؟؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میں ۔!" جھنا کر عافیہ بولی۔

"سنو جانانہ ! بات یہ ہے کہ۔ اچھا تم پہلے کچھ چائے وائے پیو۔ موڈ درست کرو۔ پھر پوری بات بتاؤں گا ! سن کر تم اپنے اُس نصیب پر فخر کرو گی۔ جس کی ابھی شکایت کر چکی ہو۔ !"

"اچھا منگائیے چائے۔ !" بڑی فراخ دلی سے عافیہ نے حکم دیا۔

"کتنی اچھی لگتی ہو اس طرح بولتی ہوئی۔"

دانش نے لڑکے سے چائے اور بسکٹ منگوائے۔ اصرار کر کر کے اسے کھلائے۔ اور پھر جب دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے تو دانش نے کہا "میں تم سے جان بوجھ کر نہیں ملا۔ امی نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ایم۔ ڈی کر رہا ہوں۔ کرنل اکرام نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے تین سال کے لیے اٹلی بھجوا دیں گے۔ میں وہاں سے ڈگری لے کر آؤں گا تو پھر ایک

کروں گی تب تک میں۔ کیسے جیوں گی ؟۔"

"دعائیں مانگا کرنا عافیہ۔" دفعتہً دانش سنجیدہ ہو گئے۔

"میں اپنے مشن میں کامیاب رہوں۔ اور کامیاب ہی واپس آؤں تم معصوم ہو۔ مظلوم ہو۔ بہت اچھی ہو۔ تمہاری دعائیں خدا ضرور سنے گا۔ ضرور قبول کرے گا۔!۔"

وہ سوکھی سوکھی سانسیں لیتی رہی۔

"اور پھر مجھے خط لکھا کرنا۔ لمبے لمبے خط۔ اچھا ؟۔" دانش نے کہا۔ "روز کی رپورٹ، تم نے اس روز کون سے رنگ کا کس قسم کا لباس پہن رکھا ہے۔ صبح کو ناشتہ میں اور دوپہر کے کھانے میں کیا کھایا ہے۔ مجھے بھی کھاتے وقت یاد کیا ہے کہ نہیں۔ تمہارے مطالعہ میں کون کون سی کتابیں ہیں۔ رات کو کیسے پیارے پیارے خواب دیکھتی ہو۔ یہ سب لکھ دیا کرنا۔ میں بھی لکھا کروں گا بس اس طرح آدھی ملاقات کے سہارے ہمارے تمہارے دن کٹ جائیں گے اور پھر انشاء اللہ پوری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ جیون کے پل بھاگ رہے ہیں عافیہ۔ جو لمحے ہمیں پہاڑ ایسے لگ رہے ہیں۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی سمٹ کے کہیں ماضی کے غاروں میں جا پڑیں گے اور ایک جگمگاتا ہوا حال نہایت شاندار مستقبل ہمارے سامنے۔ زندگی گزارنے کے لیے ایک دل کش یاد ایک خوبصورت بہانہ کافی ہے۔ ہے نا۔؟۔"

"نجانے تب دن کیسے ہو جائیں گے۔!" عافیہ نے بے حد کرب

سے کہا۔ "وہ میرے شب و روز۔ جو کھوکھلے ہوں گے۔ جن میں آپ نہ ہوں گے۔ کیسے گزار سکوں گی میں انہیں۔ اچھا۔ آپ کب جا رہے ہیں۔؟"

ارے۔ تم تو اس طرح گھبرا رہی ہو۔ جیسے میں اسٹیشن پر کھڑا ہوں اور بس میری ٹرین آنے ہی والی ہے۔" دانش نے ہنس کر کہا "اس طرح اداس مت ہو۔ ابھی دو مہینے کا طویل وقت پڑا ہے۔ اور پھر۔ میرا جانا بھی ایساطے نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نہ جا سکوں۔!"

"آپ جائیے۔ خدا کرے کہ آپ کامیاب اور بامراد واپس آئیں۔ میں لمحے لمحے گنتے کسی طرح یہ مدت کاٹ ہی دوں گی۔!"

"دل سے کہہ رہی ہو۔؟۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"دل کی بات مت کیجیے۔ دل اپنے بس میں ہوتا کب ہے؟" عافیہ نے کہا۔ دانش چپ ہو گئے۔ دیر تک دونوں خاموش رہے پھر عافیہ بجھی ہوئی مسکراہٹ سے بولی۔" آپ کتنے دنوں سے گھر بھی نہیں آئے۔؟ خفا تو نہیں ہیں؟۔"

"بس اسی چکر میں رہا تھا۔ فرصت ہو گی تو ضرور آؤں گا۔"

"جاؤں میں۔؟"

"کیوں جاؤ۔ بیٹھو تو بہت سی باتیں کریں۔ مجھے بھی کل صبح تک فرصت ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔!"

"میں شوپنگ کا بہانہ کر کے آئی تھی۔"

"تو پھر۔ شوپنگ تو تم نے کی ہی نہیں۔؟۔"

"کہہ دوں گی۔ مجھے کوئی کپڑا پسند نہیں آیا۔!"

"عافیہ!"

"جی!"

"چلو میرے ساتھ۔ ہم شوپنگ کریں۔؟"

"نہیں نہیں۔ اسی لیے میں آپ سے کچھ کہتی نہیں۔ آپ فوراً کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔!"

"برقعہ تو پہنے ہو تم۔ کسے پتہ چلے گا! دیکھنے بھی کون آرہا ہے۔" دانش نے کہا اور اس کا بازو تھام کر اٹھا دیا۔

"میں نہیں چلوں گی۔ سنا آپ نے۔!" اس نے احتجاج کیا۔

"خیر ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔" دانش نے کہا۔ "میں تمہارا کون ہوتا ہوں۔؟۔ اچھا۔ تو پھر خدا حافظ!" انہوں نے گال پھلا لیے اور رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ عافیہ بے بسی سے ہنسنے لگی۔

"میرا مطلب یہ کہاں تھا کہ آپ ناراض ہو جائیے۔!"

"مجھے راضی کرنا مقصود ہو تو چلو میرے ساتھ!۔"

"چلیے!" اس نے ہتھیار ڈال دیئے!

دانش کا چہرہ چمکنے لگا۔ لڑکا بے چارہ باہر بینچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اسے بھی رہائی ملی۔ کلینک بند کر کے اس نے اپنی راہ لی۔ اور دانش، عافیہ کے ساتھ باہر نکلے! اتوار کا روز تھا۔ بیشتر دکانیں بند تھیں۔ مگر معمولی سی شوپنگ کی حد تک تو اکثر کھلی ہوئی تھیں۔ عافیہ

کے منع کرتے کرتے دانش نے اس کے لیے کئی ایک کپڑے خرید لیے۔ پھر جب وہ بڑا سا بنڈل سنبھالے دوکان سے باہر نکلے تو بولے "جی چاہتا ہے کہ ایک انگوٹھی خرید دوں اور کسی مسجد میں چل کر خدا کو گواہ کر کے تمہیں پہنا دوں کہ تم میری ہو چکیں اور میں تمہارا ہو چکا۔!"

"دانش صاحب۔" ایک سسکی سی لے کر عافیہ نے کہا۔ "خدا گواہ ہے میں ہمیشہ سے آپ کی ہوں۔ اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔!"

"ہاں عافیہ۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی۔ ہم ساتھ جئیں گے۔ اور ساتھ ہی دنیا سے جائیں گے۔"

اس رات جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اتنی ہلکی پھلکی ہو رہی تھی کہ جیسے روح پر لدا ہوا منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ غیر معمولی مسرور اور متبسم۔ حتیٰ کہ اپنی بے پناہ خوشی وہ چھپا نہ سکی۔! حمزہ نے وجہ پوچھی تب ایک معمولی سا لطیفہ اسے سنا کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔!

محبت زندگی ہے۔!

اور بیگم صاحبہ اپنے بستر پر پڑی سوچ رہی تھیں۔ اب اس کے ہاتھوں میں مہندی لگ جانی چاہیے۔ کچھ دنوں پہلے جب ڈاکٹر دانش کی امی ملنے آئی تھیں تب کچھ تذکرہ کیا تھا کہ عافیہ کو وہ اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔ دانش بچپن کا دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ اور اب اس کا مستقبل بھی محفوظ تھا۔ بس ایک کھٹکا ان کے دل میں یہ تھا کہ دانش کے گھر میں مذہبیت بہت زیادہ تھی یوں تو ان کے والد ظہیر صاحب پولیس میں کسی معقول عہدے پر تھے۔ ظاہراً خاصے ترقی پسند نظر آتے تھے مگر اندر سے سخت قدامت پرست۔ ان کے گھر

میں گھر ہی کی خواتین سارا کام کاج نمٹا لیا کرتی تھیں۔ پندرہ سولہ سال کے لڑکے تک سے پردہ کیا جاتا تھا۔ اور عافیہ اتنی رجعت پسند نہ تھی وہ سیر و تفریح کی دلدادہ اور قدرے کاہل بھی تھی۔ چولھے پاس کے کام سے اس کا دم نکلتا۔ اس نے آج تک نہ تو ہاتھ میں جھاڑ دیکڑی تھی، نہ کوئی جھوٹا برتن دھویا تھا۔ وہ ماں باپ دونوں کی چہیتی تھی۔ اس کی امی سوچتی تھیں کہ بھلا وہ ایسے گھر میں کھپ بھی سکے گی۔؟ لیکن وہ دانش کے رشتہ پر دل سے خوش تھیں۔ دانش سمجھ دار بھلا مانس ہے۔ وہ کسی طرح عافیہ کو نبھالے جائے گا! اب وہ منتظر تھیں کہ دانش کی امی سلسلہ جنبانی کریں تو وہ قطعی حامی بھر دیں گی۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ جوان لڑکی جس قدر جلد اپنے گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ... حمزہ کی انھیں اتنی فکر نہ تھی۔ وہ کہہ ہی چکا تھا کہ تعلیم ختم کر کے خلیجی ملک چلا جائے گا۔!

کریمی صاحب خاصے رو بصحت تھے۔ معقول علاج سے اتنا تو ہوا تھا کہ وہ اب چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چل لیتے تھے۔ ان کا ہاتھ بھی کسی قدر کام کر سکتا تھا۔ اور وہ بے حد خوش تھے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ دل سے وہ اپنے غم گسار ہمدرد اور انسان نواز دوست کو لاکھ لاکھ دعائیں دیتے۔ ایک مرتبہ بیرسٹر صاحب نے انھیں اپنی کار پر لے جا کے انھیں وہ مکان بھی دکھا دیا تھا۔ جو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اور شاید فنشنگ ہونی باقی تھی۔ مکان کو دیکھ کر کریمی صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ تو خواب میں بھی اس طرح نہ بنوا سکتے۔ بیرسٹر صاحب نے جانے کتنا خرچ کیا تھا۔

اس قدر خوشنما اور دیدہ زیب گھر تھا کہ چھوٹی موٹی کوٹھی لگ رہا تھا
کریمی صاحب ممنون کم تھے اور شرمندہ زیادہ۔!

"تم نے اپنے سلوک سے مجھے باندھ لیا ہے بھائی۔ بھلا بتاؤ
میں بے بضاعت اور تہی دست تمہارے اس احسان کا کیا معاوضہ دے سکوں گا؟"
کریمی صاحب کو اظہار تشکر کے الفاظ نہ ملے۔ بیرسٹر صاحب کو ناگوار گزرا
"ارے سب کچھ تمہارا ہے بھائی۔ میرا اب رہا ہی کون ہے۔ نہ بیوی نہ
بیٹی۔ نہ کوئی اور بال بچہ۔ نہ بھائی بہن۔ اللہ نے جو کچھ دیا ہے وہ میں اپنے
ساتھ تو لے نہ جاؤں گا۔ اچھا ہے کہ تمہارے کام آئے۔ اس میں احسان
اور بدلے کا کیا سوال ہے۔ غیریت کی باتیں نہ کرو۔! دل کو ٹھیس پہونچتی
ہے۔!" وہ بولے۔

"اتنے قیمتی پتھر کیوں بچھوا دیئے۔ اتنی خوشنما جالیاں کیوں لگوادیں"
"گھر بنوا رہا تھا بھائی۔ بٹی کا تو وہ نہیں۔ اب صرف اسنتر کاری رہ
گئی ہے۔ پھر اللہ کا نام لے کر اس میں شفٹ ہو جانا۔ وہ تمہارا کرایہ کا مکان
تو اچھا خاصہ مرغیوں کا ڈربہ ہے۔ کمرے تاریک، دیواریں بوسیدہ چھت
سر پہ آئی جاتی ہے۔ اسی لیے تو تم سب کی صحت مخدوش رہتی ہے۔"
بیرسٹر صاحب نے بڑی فیاضی سے کہا۔

"تمہارا یہی احسان کیا کم ہے کہ محض تمہاری توجہ اور خلوص نے مجھے
اس قابل کیا کہ میں آج اپنے پیروں سے چل پھر رہا ہوں۔ ورنہ جانے کب
تک مغضۂ گوشت بنا بستر پہ پڑا رہتا۔!"

"اچھا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب اس کا تذکرہ بیکار ہے۔!"

کریمی صاحب کے دل میں بیرسٹر صاحب کی وقعت و محبت اتنی گھر کر چکی تھی کہ اگر وہ اپنی چشم و ابرو کا ہلکا سا اشارہ بھی کرتے تو کریمی صاحب اپنی جان ان پر نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتے۔ پہلے پہل بیوی بچوں کی تنقید اور بیرسٹر صاحب کی غیبت میں وہ بھی کچھ شریک ہو جاتے مگر اب یہ عالم تھا کہ وہ ان کی رتّی بھر برائی نہ سن سکتے بلکہ اگر بیوی کے منہ سے بھولے سے کوئی بات بیرسٹر صاحب کے بارے میں نکل جاتی تو کریمی صاحب سخت برہم ہو جاتے۔!

وہ تو ان پر فدا تھے۔ مگر بیگم صاحبہ کے دل میں شکوک و شبہات کے ہالے کھڑے ہوتے گئے۔ ان کا ایمان تھا کہ بیرسٹر صاحب محض دوستی اور خدا ترسی کی بنا پر یہ سب کچھ نہیں کر رہے تھے۔ مگر ان کا مفاد کیا تھا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہر حال تھک ہار کر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔!

ایک دن اتفاق سے ڈاکٹر دانش بھی کریمی صاحب سے ملنے آئے اور انہیں قریب قریب صحت مند دیکھ کر بہت خوش ہوئے! کریمی صاحب ناشتہ سے فارغ ہو کر کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بڑی محبت سے انہوں نے دانش کو اپنے قریب بٹھا لیا۔

"آج ادھر کیسے نکل آئے بیٹا۔!" انہوں نے اخبار بستر پر رکھ دیا۔

"پرسوں ظہیر بھائی ملنے آئے تھے کہہ رہے تھے کہ تم عنقریب کہیں باہر جا رہے

ہو۔ مجھے تو بڑی وحشت ہوئی میاں۔ اپنے ملک کے ہونہار اور قابل نوجوان اپنی خدمات اور فن باہر کے لوگوں کے لیے مختص کر دیں گے تو پھر اپنے ملک میں کیا باقی بچے گا۔ تم نے باہر جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے۔ کیا یہاں ترقی کے مواقع کم ہیں؟"

دانش ان کے لیکچر پر مسکرانے لگے۔

"ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا چچا صاحب۔" دراصل مجھے اس گروپ کے ساتھ روم جانے کا موقعہ ملا ہے جو قلب کے امراض پر ریسرچ کے لیے جا رہا ہے زیادہ سے زیادہ تین سال لگیں گے پھر میں انشاء اللہ وطن واپس آجاؤں گا۔ اور یہاں اپنے ملک کی خدمت کروں گا۔ چچا صاحب دیکھئے نا! اپنے یہاں اول تو اوپن ہارٹ سرجری ہوتی نہیں۔ اس فن کے ماہرین بھی بہت کم ہیں۔ اگر میں اس شعبہ میں کچھ نمایاں کام کر کے قلب کے بیماروں کو فائدہ پہونچا سکوں اور کچھ عصری آلات باہر سے لا سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا باہر جانا اتنا زیادہ تشویش ناک اور پریشان کن نہیں ہے۔؟"

"بیٹے تمہارا یہ مقصد ہے تو جزاک اللہ۔ سبحان اللہ۔" کریمی صاحب نے کہا "کب تک جا رہے ہو؟"

"جی بس۔ ضروری کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ خدا نے چاہا تو اسی ماہ کے آخر میں نکل جاؤں گا۔ میں یہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے ابا جی نے مل کر کسی نجی اور ذاتی معاملہ پر گفتگو نہیں کی۔؟"

"ہاں۔ وہ!" کریمی صاحب چونک کر دانش کو دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پل بھر تک انہوں نے دانش کو غور سے دیکھا پھر بولے۔ "کچھ اس قسم کا

تذکرہ کیا تھا انہوں نے کہ ۔ تم اور بہن صاحبہ یہ چاہتے ہو کہ ۔ تمہارے جانے سے قبل عافیہ سے ۔ مطلب یہ کہ تمہاری والدہ محترمہ کا یہ منشا ہے کہ وہ عافیہ کو انگوٹھی پہناتی جائیں ۔ ! یہی کہنا چاہتے ہو نا ۔ ؟"

"جی ہاں ۔ آپ نے ابا جی سے فرمایا تھا کہ دانش کو بھیجدو ۔ چنانچہ میں ۔۔ !"

ارے ہاں ہاں ـــــ دیکھا میاں ۔ میری ناقص یادداشت ۔" کریمی صاحب نے یاد کر کے کہا ۔ "میں بھول گیا تھا ۔ اچھا بیٹے ۔ شاید تمہیں پتہ نہیں کہ ہم بھی ۔ یعنی میں اور تمھاری چچی بھی یہی چاہتے تھے ۔ تم ماشاء اللہ ہونہار ہو قابل ہو ۔ شریف ہو ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ۔ مگر بیٹے ۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں یہاں پڑا ہوا ہوں ۔ آخر کچھ نہ کچھ تو ہمیں کرنا پڑے گا میاں ۔"

"غیر ضروری رسموں کے تو آپ بھی قائل نہ ہوں گے قبلہ ۔" دانش کا چہرہ فرطِ مسرت سے رنگین ہو گیا ۔ "آپ صرف اجازت دے دیجئے تو میں جانے سے پہلے امی کو چچی بی کے پاس بھیجدوں ۔ !"

"وہ یہاں نہیں آئیں ایک مرتبہ بھی ۔"

"کیا عرض کروں چچا صاحب ۔ روزہ وہ آپ کی خیریت پوچھتی ہیں ۔ آپ کے لیے ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہیں ۔ مگر ان کا پردہ اتنا شدید ہے کہ یہاں آتے ڈرتی ہیں ۔ کوئی بے پردہ نہ دیکھ لے ۔ مگر آپ فرمائیے تو میں امی کو کسی نہ کسی طرح یہاں لے ہی آؤں ۔ ؟"

"نہیں بیٹا ۔ پردہ کی پابندی بہت اچھی بات ہے ۔" کریمی صاحب نے کہا ۔ "انہیں یہاں لانے پر مجبور نہ کرو ۔ بس میرے سلام ان سے کہو

دینا۔ اور کہنا کہ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں۔ اور۔ یہ۔ یہ کہ۔ تمہارے اور عافیہ کے سلسلے میں وہ اپنی مرضی پوری کریں۔ میاں استغفراللہ۔ ہم میں ایک زمانے کی دوستی ہے۔ بلکہ یہ دوستی بڑھ کے عزیزداری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ کیا پھر بھی وہ اپنا حق منوا نہیں سکتیں۔ ہم سے اجازت لینے کی ضرورت سمجھتی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔"

دانش اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ میں چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی۔ چائے تھرماس میں ہوگی۔ پیتے جاؤ۔" کریمی صاحب کہتے رہ گئے۔ مگر دانش نہ رکے۔ انہیں سلام کیا۔ اور کمرے سے نکل بھاگے۔ کریمی صاحب کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اخبار اٹھاتے ہوئے بولے۔ بچے آخر بچے ہیں۔ اور دیر تک ہنستے رہے۔!

دانش نے اپنے گھر میں خوش خبری سنائی۔ ان کے والد ظہیر صاحب نے کہا۔ "یہ کوئی معقول بات تو ہے نہیں کہ باپ ہسپتال میں پڑا ہو اور لڑکی کی منگنی کی جائے۔ انہیں کچھ تو ٹھیک ہو جانے دو! اور ابھی تمہاری روانگی میں بھی دیر ہے۔!"

"اباجی۔ چچا صاحب اب یقیناً اس قابل ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے گھر آسکتے ہیں۔" دانش نے ضد کی "میں دیکھ کے آرہا ہوں انہیں۔ اب وہ ٹھیک ہیں اباجی۔!"

"اے ہاں۔" دانش کی امی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "پرسوں نرسوں بہن خیرالنساء بھی کہہ رہی تھیں۔ ناصر بھائی پہلے کے سے ہو گئے ہیں شاید

ہفتے عشرے میں گھر چلے جائیں۔ آپ میرے بچے کی خوشی میں روڑے نہ اٹکائیے نگوڑی منگنی ہی تو ہے۔ کون سا نکاح ہے جس میں باپ کی موجودگی ضروری ہے۔ اور موئی رسم سی رسم بھی نہیں۔ دھوم دھڑکا ہوتا۔ ناچ رنگ ہوتا۔ میں تھوڑی سی مٹھائی اور انگشتری لے جاؤں گی۔ لڑکی کا منھ میٹھا کر کے انگوٹھی پہنا آؤں گی۔ لڑکی کم از کم اپنے نام کی ہو تو جائے بہن خیر النساء کو اس کی بہت جلدی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اسے اور جگہ بیاہ دیں اور ایک گُن ونتی لڑکی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"دانی۔!" ظہیر صاحب نے دانش کو مخاطب کیا۔

"جی ابا جی۔!" دانش جو ماں کے لیکچر میں گم ہو گئے تھے۔ چونک پڑے۔

"بیٹے۔ اس پوری تقریر میں تمھاری اماں نے بیچ میں سانس لی؟ ظہیر صاحب بولے۔ دانش ہنس پڑے۔ بیوی چڑھ گئیں۔ "آپ کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی کہ میں بیچ میں سانس نہ لوں۔ آپ تو خدا سے یہی چاہتے ہیں۔ مگر اتنا سمجھ لیجئے کہ آپ کا گھر میرے دم قدم کی برکت سے ہے خدا بخشے اماں جان کہا ہی کرتی تھیں کہ بہو گھر میں کیا آئی ہے۔ لکشمی آئی ہے۔ وہ تو مرتے دم تک صبح اٹھ کے میرا منہ دیکھا کرتی تھیں۔ اور سسر مرحوم کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے وہ ــــ!"

ظہیر صاحب گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔ جس دن انگوٹھی اور مٹھائی لے کر چلنا ہو۔ کہہ دینا۔ دو چار پولیس والوں کو ساتھ لے کر آجاؤں گا۔!" کیونکہ تم

ایسی تھانیدار بیوی ہو تو قلب کی مضبوطی کے لیے کچھ پولیس والوں کو ساتھ رکھنا ہی چاہیئے۔ ذرا ہمت بندھی رہتی ہے۔!" ظہیر صاحب بولے۔

" اے ہٹیئے۔! لڑکا سامنے بیٹھا ہے اور آپ بڈھے چونچلے بگھارنے چلے ہیں۔" وہ کھسیا گئیں۔ ظہیر صاحب ہنستے ہوئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ خود بخود ہنس دیں۔ لے بیٹا دیکھ۔ تیرے باپ کو میں نے کیسی سزا دی۔ انہیں ہوا تک نہ لگی اور میں یہ یاقوت کی انگوٹھی تمہاری دلھن کے لیے خرید لائی ہوں۔ وہ اللہ کا بندہ دس پندرہ روڑے اٹکا دیتا۔ خوشی کا کوئی کاج تو اُس مرد آدمی کو اچھا لگتا ہی نہیں انہوں نے کرتے کے گریبان سے ایک ننھی منی سرخ رنگ کی ڈبیہ نکالی اور دانش کو تھما دی۔

" امی آپ چپکے چپکے خوب کام کرلیتی ہیں۔" دانش انگوٹھی دیکھ کر خوش ہو گئے۔ " آپ کو ناپ کیسے معلوم ہوئی۔!"

" ارے میں کوئی نا سمجھ بچی ہوں بیٹا۔؟" وہ فخریہ ہنس کر بولیں۔

" اُس روز بے چاری آئی تھی تمھیں پوچھتی ہوئی۔ بیٹا تم بھی خوب ہو۔ اُس سے ملے کیوں نہیں۔ باپ کی چھاؤں تم پر بھی پڑ رہی ہے۔ نوج ان کا ایسا کوئی کٹھور ہو۔ پولیس کی نوکری کرتے کرتے دل پتھر ہو گیا ہے۔ مگر ایک خوبی ہے کہ میرے ساتھ موم بنے رہتے ہیں۔ الیسا نہ ہوتا تو سچ جانو کہ زندگی ہی دوزخ ہو کر رہ جاتی۔ ہماری نانی اللہ بخشے کہے ہی تھیں کہ لڑکا پولیس میں ہے۔ نجانے کیسا ہوگا مگر ہمارے ابا نے ۔۔!"

ان میں یہ عیب تھا کہ بولتی بہت تھیں اور اصلی موضوع کو راستے پر

چھوڑ کر کئی اور راستوں پر نکل جاتی تھیں۔ دانش نے وحشت زدہ ہو کر بات کاٹی۔

"وہ آپ کو اپنی ناپ دے گئی تھی امّی۔؟"

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آئی تھی اس دن تم کو پوچھتی پوچھتی۔! تبھی میں نے دیکھا کہ اس کی انگلی میں سفید نگ جڑی انگوٹھی تھی۔ میں نے بہانے بہانے سے کہا کہ بٹیا یہ انگوٹھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ چند روز میں پہنوں۔ بس میری بھولی بھالی بچی نے یہ کہہ کر مجھے دے دی کہ چچی بی آپ ہمیشہ پہنے رہیئے۔ کچھ آپ سے بڑھ کر تھوڑی ہے۔ بس اُسی کی ناپ کی یہ لے آئی ہوں میں۔"

ان کو داد دینے کی خاطر دانش نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں بولے۔ "واہ واہ امی۔ آپ نے بھی کمال کر دیا۔ ویسے تو وہ بھلا کاہے کو دیتی۔؟"

وہ کچھ نہ بولیں۔ بس داد وصول کرنے کے انداز میں ہنس دیں۔ پھر بولیں۔ "سن بچے۔ آج ہے نگوڑا ہفتہ۔ جمعہ جمعرات کچھ ہوتا تو میں آج ہی من کی مراد پوری کر آتی۔ اب کل اتوار ہے نا۔ صبح ہی صبح چلی جاؤں گی بہن سے ملنے اور وہ تو کیا کہتا ہے۔ نگوڑا پوسٹ مارٹم۔؟"

"پوسٹ مارٹم۔؟" دانش نے اب کی سچ مچ حیرت سے کہا۔

"ہاں وہ جو کسی کو قطعی حکم دے دیتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

دانش کو ہنسی آگئی۔ "الٹی میٹم۔!"

"ہاں یہی۔" وہ بھی خوش دلی سے ہنس دیں۔ "یہی دے

آؤں گی بہن کو کہ بس اللہ نے چاہا تو پیر کے مبارک دن میں رسم لے کے آرہی ہوں۔!

"اتنی جلدی۔ امی۔؟" امڈ آنے والی خوشیوں کو بمشکل ضبط کر کے دانش نے کہا۔

"جلدی۔؟ ارے جلدی کا ہے کی؟ لو اور سنو۔ باپ کی سی بدعقلی کی باتیں۔" وہ بگڑیں۔ "یہ کہو کے اتنی دیر کیوں کر دی۔ آج تمھارے باپ اور بھائی ناصر مان جاتے تو تو اللہ رکھے دو بچوں کا باپ ہوتا۔ دیکھتا نہیں۔ تیری ہی عمر کا وہ موا اختر ہے۔ دو بچے ہیں اس کے گلاب کے پھول ایسے۔ اور اللہ کی جان کی سلامتی دے۔ اس کی دلہن پھر دو جی سے ہے۔ یہاں ابھی تک رسم ہی نہیں ہو چکی۔" وہ یکایک آبدیدہ ہو گئیں۔ "تم جا رہے ہو۔ نہیں نہیں کر کے بھی تین سال بہت ہوتے ہیں۔ پل بھر بعد کیا ہونے والا ہے۔ آدمی کو پتہ نہیں۔ اللہ اصل خیر سے تم کو واپس لائے۔ میرے آنگن میں چھم چھم کرتی میری بہو چلے پھرے۔ میرے بیٹے کے لال میری گودی میں کھیلیں کودیں۔ اور بس اس کے سوا مجھے کیا چاہیے۔" وہ رونے لگیں۔

"اُو۔ میری امی۔ یہ مت کیجئے۔!" دانش ماں کے سینے سے لگ گئے۔ "اگر آپ کو ایسا ہی برا محسوس ہو رہا ہے تو لیجیے۔ میں نہیں جاتا۔ آپ میری شادی کر دیجیے۔ آپ کی تمناؤں سے بڑھ کر میری کوئی آرزو تھوڑی ہے۔ امّی۔ مقدّم آپ کی مرضی اور خوشی ہے۔ بس امی آپ رسم وسم نہیں۔ شادی ہی کی تاریخ ٹھہرا کے آئیے! اچھا؟"

"اے بیٹیا۔ وہ بھی صحیح ہے کہ تمہارا مستقبل بننا بھی تو ضروری ہے۔" انہوں نے آنسو پونچھے اور بولیں۔

"میں اپنی تمنا کے آگے تمہاری زندگی کیسے برباد کر دوں۔ اللہ کی مرضی ہوگی۔ میری آرزو کی لاج بھی وہ رکھ لے گا۔!"

چنانچہ دانش کے گھر میں اسی روز سے شادی کا سا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ظہیر صاحب کی لڑکی کوئی نہ تھی۔ پانچ لڑکے تھے۔ انہوں نے ماں کو تنہا گھر گرہستی سنبھالتے دیکھ کر لڑکیوں کے سے کام کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اگر امی کی طبیعت کچھ سست ہوتی تو پانچوں لڑکے کام سنبھال لیتے دانش کے ذمہ صبح کا ناشتہ ہوتا۔ وہ چائے بناتے۔ اور سب کو ناشتہ کراتے۔ ان سے چھوٹا تابش آٹا گوندھ لیتا۔ اس کام میں وہ خوب ماہر ہو گیا تھا۔ تیسرا طلحہ سودا سلف لاتا۔ دال چاول پکاتا اور چھوٹے لڑکوں کے سپرد یہ خدمت تھی کہ وہ گھر میں جھاڑ دیں۔ اور برتن صاف کریں۔ سب بے حد فرماں بردار اور سعادت مند تھے۔ ہنسی خوشی سب کام کرتے۔ چنانچہ انھیں جب پتہ چلا کہ بڑے بھائی کی منگنی ہونے والی ہے تو طلحہ صاحب جا کے کرائے پر ڈھولک لے آئے۔ شہباز اور شیراز اپنی پڑوسن آپا زیبا اور باجی رعنا کو کھینچ لائے پھر ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ لڑکیاں ڈھولک پیٹ رہی تھیں۔ ان کی سریلی آوازوں میں چاروں لڑکے اپنی موٹی آوازیں ملا کے مصرع اٹھا رہے تھے ؎

بھابی میری شمع بھیّا ہے پروانہ   دیکھو جی دیکھو نظر نہ لگانا

امی پاس بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ پان کھا رہی تھیں۔ اور اس شور بے ہنگام سے بے حد محظوظ ہو کر خود بھی تالیاں بجا بجا کر آواز ملانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دالان کی چھت اڑی جا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں قہقہے، آوازے۔ فقرے بازی۔ ایک ادھم مچا ہوا تھا۔ کرامی حد سے زیادہ مسرور تھیں۔ انہیں یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دوسرے دن انہوں نے کریمی صاحب کے گھر میں اطلاع کروائی گویا الٹی میٹم ہی دے دیا۔ اور پھر تیسرے روز خاصے اہتمام سے خود بھی چند ایک خواتین اور اپنے بچوں کے ساتھ جا دھمکیں۔ کریمی صاحب کی بیوی کی دیرینہ مراد بر آئی تھی۔ وہ تو عافیہ کے سلسلے میں خاصی پریشان رہتی تھیں۔ اب انھیں ایک گونہ سکون ہو گیا۔ پھر بھی ایک کانٹا سا ان کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ ظہیر صاحب اگر چاہتے تو اس رسم کو نکاح کے مقدس فریضے میں بدل سکتے تھے۔ کیا انہیں اپنے بیٹے پر بھروسہ نہ تھا یا دانش کی نیت صاف نہ تھی۔ بہر حال ساری سے آدھی بھلی۔ اس روز کوئی تین ماہ بعد کریمی صاحب نے بھی گھر کی صورت دیکھی تھی۔ ظہیر صاحب خود جا کے انہیں لائے تھے۔ اب وہ اس قدر صحت مند تھے کہ کسی سہارے کے بغیر پولیس جیپ سے اتر کر اندر آئے تھے۔ بیگم کریمی نے دوہری خوشی کے موقعہ پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔ ! کریمی صاحب کے اچھے ہونے کی توقع کسے تھی؟

مردانے میں خاصی چہل پہل تھی۔ اور اندر بھی بڑا پر مسرت ماحول تھا۔ گویا ایک چھوٹی موٹی شادی کی محفل تھی۔ اس مبارک و مسعود موقعہ

قدیم باغ عامہ کے ایک ہرے بھرے کنج کی آڑ میں دانش اور عافیہ بیٹھے تھے۔ طائرِ الفت کی پرواز بہت بلند ہوتی ہے۔ محبت کرنے والے دل کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور معاملہ جب ایک طویل جدائی برداشت کرنے کا ہو۔ تب تو دل کی بے قراری کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔

اس روز جب دانش نے ہمیشہ کے لیے اپنا کلینک اپنے ساتھی ڈاکٹر سجاد کے سپرد کر دیا تھا۔ تب وہ ویمنس کالج پہونچ گئے تھے۔ عافیہ کے نام پرنسپل کی وساطت سے ایک پرچہ بھجوایا کہ کریمی صاحب نے فوراً اسے ہسپتال طلب کیا ہے۔!

پرنسپل سے پرچہ پاکر عافیہ بدحواس ہوگئی۔ اس کی کلاس کی تمام لڑکیوں کو پتہ تھا کہ اس کے ابا بیمار ہیں۔ عافیہ کی گریۂ وزاری سے متاثر ہو کر اس کی سہیلیاں اسے دلاسہ اور تسلی دینے لگیں۔ عافیہ تو یہی سمجھی کہ کریمی صاحب چل بسے۔

بہرحال وہ باہر نکلی۔ اور دانش کو دیکھ کر اس کا حال اور ابتر ہو گیا۔ البتہ دانش کا ہنسی ضبط کرتے کرتے دم نکلا جا رہا تھا۔! عافیہ کو پردے کا خیال رہا تھا نہ اپنی پوزیشن کا۔ یہ بھی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ دانش کو منگیتر کی حیثیت سے دیکھ کر کچھ جھینپتی یا شرماتی۔ لبسورتی ہوئی بولی:

"میرے ابا جان۔؟" آگے وہ یہ نہ پوچھ سکی کہ وہ کیسے ہیں۔ کیوں بلا رہے ہیں۔
ایک آٹو رکشہ کی طرف اشارہ کر کے دانش نے کہا۔ "بیٹھو۔"
اور خود بھی اس کے پاس ٹک گئے۔ آٹو ڈرائیور سے پہلے ہی سے کچھ کہہ رکھا تھا۔ وہ زن سے آٹو لے اڑا۔
عافیہ کو تو تب ہوش آیا۔ جب وہ جانے پہچانے سے بڑے گیٹ پر اترے۔
"یہ کیا۔؟" وہ بگڑ گئی۔
آٹو کے مڑتے ہی دانش کے قہقہے کا بند کھل گیا۔ عافیہ اپنے پاگل بن جانے پر بے حد خفا تھی!۔ دانش سے شرم بھی آرہی تھی۔ بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ کہدوں گی ابا جان سے کہ آپ نے مجھے ایسا دھوکا دیا۔ اف فوہ۔ دل ابھی تک قابو میں نہیں ہے۔ نجانے کیسے برے برے خیال آرہے تھے۔"
"تم تو سڑک ہی پر بھٹکارنے لگیں۔" دانش نے مُسمُسی شکل بنائی۔ "صرف منگنی میں یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو شاید اٹھا بیٹھی کرواؤ گی۔"
"آپ سچ مچ بہت بُرے ہیں!" وہ سرخ ہو گئی۔
"کیا کروں۔ دل کی لگی بہت جان لیوا چیز ہوتی ہے۔" دانش نے اس کی کلائی تھام لی۔ "آؤ۔ ادھر پارک میں چل کے بیٹھیں۔ باتیں کریں۔ ترس کھاؤ میری جان مجھ پر کہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے!"
اور عافیہ پگھل گئی۔

وہ جگہ بہشت کا ایک گوشہ تھی۔ آس پاس ٹھنڈا ٹھنڈا سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ سامنے اور ارد گرد مہکتے ہوئے رنگین پھولوں کی بہتات تھی۔ ان کے سروں پر سنکیسر کے گھنے درخت کا معطر سایہ تھا۔ پتوں سے دھوپ چھن چھن کر سبزے پر آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔! دانش ہار سنگھار کے پیڑ سے پیٹھ ٹیک کے بیٹھ گئے۔ عافیہ جھینپی

جھینپی سی ان کے پاس بیٹھی گھاس کی ننھی ننھی پتیاں نوچ نوچ کر پھینک رہی
"کچھ باتیں کرو عافیہ۔! یہ کیا۔ ادھر دیکھو میری طرف!" دانش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف موڑا۔
"کچھ بھی ہو۔ یہ کام آپ نے بہت برا کیا ہے۔" عافیہ بولی۔
"کیا برا کام کیا ہے۔" وہ بھی بگڑ گئے۔ "کیا کسی دوسری لڑکی کو بھگا لایا ہوں اپنی ہونے والی بیگم کے ساتھ گھومنا پھرنا ابھی کسی جرم کے تحت نہیں آیا ہے!۔"
"اچھا تو کیجئے باتیں۔!"
"میری طرف منہ کر کے بیٹھو۔!"
وہ تھوڑی سی مڑ گئی۔ دانش دفعتہً آگے جھکے اور اسے بازوؤں میں لے کر اپنی طرف گھما لیا۔ ان کے لبوں پر شریر مسکراہٹ دیکھ کر عافیہ پانی پانی ہو گئی۔
"تمہارے ساتھ زبردستی بہت کرنی پڑتی ہے۔" وہ ہنس رہے تھے۔ "کوئی بات سیدھے سبھاؤ مانا کرو تو میں بھی شرافت سے پیش آؤں۔!" انہوں نے اس کا تکلّف اور حجاب دور کرنے کے لیے اپنے پیچھے سے ایک بڑا سا لفافہ اٹھایا اور عافیہ کو تھما دیا۔! "کھولو اسے۔ کھاؤ۔ بہت سی چیزیں لے آیا ہوں۔ آخری بار ساتھ ساتھ کھا پی لیں۔!"
"بار بار ایسا مت کہا کیجئے۔" عافیہ نے شکایت کی۔ "میرے دل پر گھونسہ سا لگتا ہے۔"
"اچھا اچھا۔" وہ دل پذیر ہنسی کے ساتھ بولے۔ "دراصل میں خود بھی بے چین سا ہوں نا۔ اور اپنی یہ کیفیت کسی کے سامنے رکھ نہیں سکتا۔ میں چاہتا ہوں۔ میری اس بے چینی میں کم از کم تم تو ساتھ دیا کرو۔!"
"آپ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ کم بے چین ہوں۔" رفتہ رفتہ وہ کھل گئی۔ "اللہ جانے

کہ خواہ مخواہ آپ کو باہر جانے کا دھیان کیوں آگیا۔ سچی۔ ایمان سے۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے۔ اب ہم کبھی مل ہی نہ سکیں گے۔ اس وہم کے مارے مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی!"

دانش کی بذلہ سنجی کافور ہو گئی۔ "یوں نہ سمجھو۔ تم میری زندگی ہو۔ اور زندگی سے جدائی کا تصوّر محال ہے۔ ہاں عافیہ۔ دل تو میرا بھی دھڑکتا ہے۔ لیکن یہ کچھ مقدر ہی ہو گیا ہے۔ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ پہلے ایک اور میرا ساتھی منتخب ہوا تھا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کی جگہ کرنل اکرام صاحب نے مجھے فٹ کر دیا۔ لیکن بھئی۔ یہ کیا باتیں شروع ہو گئیں۔ میں اس لیے تو تمہیں یہاں نہیں لایا تھا کہ تم خود بھی بور ہو جاؤ اور مجھے بھی بور کرو۔!"

"آپ کیجئے باتیں۔ میں صرف سنوں گی۔!"

"میں تمھاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

"سنیے۔" دفعتہً وہ کچھ یاد کر کے بولی۔ "ایک بات کا مجھے سچ سچ جواب دیجئے۔!"

"بالکل سچ سچ۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے۔!" وہ مسکرائے۔

"کیا آپ کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھیں گی؟"

"لڑکیاں۔ کیا مطلب؟" دانش نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ۔ اگر خدانخواستہ کسی لڑکی نے آپ کو۔!"

دانش نے اچانک اس کے کھلے ہوئے منہ میں نمکین کاجو رکھ دیا۔ عافیہ جھجھک کر رہ گئی۔ انہیں ہنسی آگئی۔ کاجوؤں کا ایک پھنکا مار کے بولے "سنو! مس ناصر۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں لڑکیاں ہوں۔ لیکن کوئی اس قدر احمق نہیں ہو سکتی کہ مسٹر دانش جیسے ناکارہ کو پسند کرنے لگے۔ ان کے جملہ حقوق

"چچی بی کے نام جو خط لکھئے گا اس ہی میں میرے نام کا پرچہ بھی رکھ دیجئے گا"
"کیسی باتیں کرتی ہو۔" دانش نے کہا۔ "امی نے بھولے سے بیرا روحانی خط
پڑھ لیا تو دل میں کیا سوچیں گی ؟"
عافیہ مسکرانے لگی۔ "لکھ دوں گی۔ اگر آپ بھی ذرا براہ کرم اپنے قلم کو بے لگام
نہ کر دیجئے گا۔ پتہ نہیں۔ آپ کا خط ابا جان ہی پڑھ لیں۔!"
حواسوں میں رہنا مشکل ہے۔
جب دوپہر گرم ہوگئی تو دونوں اٹھ گئے۔! دانش نے اٹھ کر ایک ہلکی سی
انگڑائی لی اور لباس برابر کرتے ہوئے بولے:
"عافیہ۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ پھر ہم تین سال کے لیے جدا ہو جائیں
گے۔ آؤ۔ ہم یہیں سے رخصت ہولیں۔!" انہوں نے اپنے بازو پھیلا دیئے
عافیہ چند لمحوں بے بسی سے انھیں دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو
تیرنے لگے پھر وہ جیسے سحر زدہ سی آگے بڑھی اور دانش کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔
اسی ماہ کے ختم پر دانش اپنے ساتھیوں سمیت اٹلی چلے گئے! کچھ عرصہ تک عافیہ
کے دل پر غم کے بادل چھائے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ خود کو سنبھال سکی۔! یہ تو ہونا
ہی تھا۔ کوئی اس کی محبت پر اپنا مستقبل تو نثار کر نہیں سکتا۔! وہ ماں باپ
سے چھپا چھپا کر دانش کو لمبے لمبے خط لکھتی۔ جنھیں بھجوانے کی نوبت نہ آئی کیونکہ
ابھی تک دانش کے پہونچنے ہی کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ عافیہ کو کبھی کبھی وحشت سی
اٹھتی۔ اس کی وارفتگی کا یہی حال رہا تو یہ طویل عرصہ کیوں کر گزرے گا۔!
پھر ایک بڑا دل خوش کن موڑ ان سب کی زندگی میں آیا۔
ایک دن بیرسٹر صاحب نے مژدہ سنایا کہ "بیت الکریم" مکمل ہو چکا۔ اور
اپنے مکینوں کا منتظر ہے۔! وہ اب تقریباً روز ہی گھر آنے لگے تھے۔ کریمی صاحب کو

اسپتال سے چھٹی مل چکی تھی ۔ وہ بہت صحت مند تھے ۔ اور چھڑی کے سہارے آسانی سے چل پھر سکتے تھے۔ انھیں امید تھی کہ دوبارہ اپنی ملازمت پر رجوع ہوجائیں گے ۔ اپنے اس صحت مند دورِ حیات کو وہ خدا کا فضل اور بیرسٹر صاحب کا اخلاص ومحبت سمجھتے تھے ۔ بیرسٹر صاحب سے ان کی گرویدگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اگر وہ کبھی آنے میں دیر لگاتے تو کریمی صاحب بے قرار نظر آتے ۔ !

کریمی صاحب کی بیوی کا بھی بیرسٹر صاحب سے کوئی پردہ نہ رہ گیا تھا۔ اب تو وہ بھی کسی حد تک اپنے غلط خیالوں پر پشیمان رہتی تھیں ۔ ناحق انہوں نے بیرسٹر صاحب کو خود غرض اور مفاد پرست کہا تھا۔ ان کا تو کوئی مطلب ہی نہ نکلا تھا ۔ نہ آج تک انہوں نے کریمی صاحب سے کچھ مانگا تھا۔ عافیہ اور حمزہ جو اُن سے بدظن تھے ۔ وہ بھی اپنے خیال بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ لہٰذا اب بیرسٹر صاحب ان کے مختصر سے کنبے کے ایک اہم اور پسندیدہ فرد بن چکے تھے ۔ بے چارے قابلِ رحم بھی تو تھے بیوی نے داغِ مفارقت دے دیا تھا۔ بیٹی خدا جانے کہاں تھی۔ اس کا کوئی پتہ نشان نہ تھا۔ بے چارے اکیلے اداس آدمی تھے ۔ اگر اپنوں میں آکر تھوڑی دیر ہنس بول کر اپنا غم ہلکا اور تنہائی دور کر لیتے تھے تو کیا گناہ کرتے تھے ۔ ؟

پھر بہت عرصہ کے بعد کریمی صاحب کی آرزو پوری ہوئی ۔ بیرسٹر صاحب نے زور دیا کہ خالی گھر شیطان کا ڈیرہ انہیں فی الفور بیت الکریم کو آباد کرنا چاہیئے ! ان کی خواہش اتنی معصومانہ اور بے لوث تھی کہ کریمی صاحب آمادہ ہو گئے ۔ !

پھر بڑی تیزی سے منتقلی عمل میں آئی ۔ !

بیت الکریم ایک خوب صورت سی کوٹھی تھی ! دو منزلہ خوشنما سی عمارت در و دیوار خوبصورت نیلے رنگ سے چمکتے ہوئے ۔ عمدہ دیدہ زیب جالیاں بہت قیمتی پتھروں کا فرش، سفید چمکیلے برآمدے ۔ اوپری منزل کے لیے چکر دار زینے

جس کے گرد نہایت نازک مگر مضبوط ریلنگ تھی۔ دوسری منزل نہایت خوبصورت تھی۔ ہوادار کمرے۔ سامنے کھلی چھت۔ دور دور کے مناظر نظروں کے سامنے۔ غرضیکہ کریمی صاحب کے سہانے خوابوں کی یہ دل کش تعبیر تھی۔!

شاید وہ خوش بھی تھے۔ لیکن عافیہ خوش نہ تھی۔! اسے معلوم ہوتا تھا۔ کسی نے اسے بساط سے بڑھ کر خیرات دے دی ہے۔ کسی کے سامنے احسان مندی کے احساس سے سر جھکا کر بات کرنا اسے پسند نہ تھا۔! لیکن وہ مجبور تھی۔ باپ کے ساتھ بیت الکریم اسے بھی آنا پڑا۔ یہاں نام بنام سب کے کمرے الگ تھے۔ زنانہ مردانہ دیوان خانوں کا انتظام تھا۔ حتیٰ کہ ایک ٹی۔ وی لاؤنج بھی تھا۔ جب کہ ٹی وی کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ویسے عافیہ مشکوک تھی۔ بیرسٹر صاحب اس کا بندوبست بھی کر دیں گے۔ اور انہوں نے کر دیا۔!

"بھائی صاحب۔ اپنی مہربانیوں کے جال میں ہمیں اتنا نہ جکڑیے کہ ہم پھر نکل ہی نہ سکیں۔!" بیگم کریمی نے بیرسٹر صاحب سے کہا۔

"آپ نکلنا چاہتی ہیں بھابی۔" وہ بولے۔ اور پھر دلدوز آہ بھری۔ "میرا خیال غلط نکلا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ سب میرے اپنے ہیں۔ میرے خاندان کے افراد۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں سب اپنی محبت سے مجبور ہو کر۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے دل میں اپنی کوئی جگہ نہیں بنا سکا۔! بہت بدقسمت ہوں۔"

"ارے یہ کیا۔ میرا مطلب یہ تو نہ تھا۔" وہ کچھ جھینپ گئیں۔ "آپ اپنے دل کا ملال دور کیجیے۔ بے شک ہم سب ایک ہیں۔!"

زندگی بے حد اطمینان بخش ہو گئی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ حتی الامکان کوشش کر کے حمزہ کو بھی باہر بھجوا دیں گے۔! حمزہ ان کی محبت پر دل سے ایمان لے آیا تھا۔ اب وہ ان سے متنفر اور برگشتہ نہ تھا۔

ان سب سے ملنے ظہیر صاحب اور ان کی بیوی بچے بھی آئے۔ انہیں خوش حال اور بے فکر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ظہیر صاحب نے بتایا کہ دانش اٹلی پہونچ چکے تھے۔ ان کا خط آیا تھا۔ انہوں نے کریمی صاحب کا پتہ مانگا تھا ظہیر صاحب کی بیوی نے عافیہ کو دیکھا۔ پہلے سے بڑھ کر دلفریب لگ رہی تھی۔ بہت خوش ہوئیں۔!!

عافیہ کا سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا۔ آخری پرچہ دے کر وہ باہر نکلی گرمی کی شدت سے اس کا بدن جل رہا تھا۔ آنکھوں سے بھاپ سی نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ لڑکیاں اپنی اپنی سواریوں کے انتظار میں یہاں وہاں کھڑی تھیں اب انھیں آپس میں مل کے رہنے کے مواقع نصیب نہیں ہوں گے۔ یہ خیال سب کے دلوں میں کچو کے لگا رہا تھا۔ وہ سب اپنے آئندہ کے پروگرام بنا رہی تھیں۔ کسی کو پہاڑ پر جانا تھا۔ کوئی آگے پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کسی کی شادی طے ہو چکی تھی۔! بہر حال ان کی یہ یک جائی آخری تھی۔! اس کے بعد ان کے راستے الگ اور منزلیں جدا تھیں۔

عافیہ ایک گھنے درخت کے سائے تلے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اسے تو ایم۔اے کرنا تھا۔ دو سال اسی مصروفیت میں گزر جاتے۔ انتظار کا کرب کچھ کم ہو جاتا۔ پھر ایک سال کسی نہ کسی طرح وہ کھینچ ہی لے جائے گی۔ اور پھر — وہ مسکرائی۔

"وہ آجائیں گے۔ اس کے دروازے پر شہنائیاں بجیں گی۔ دانش اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی راہوں پر لے چلیں گے۔ ننھا سا گھر ہوگا۔ دانش ہوں گے۔ اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے۔ سنہرے دن، حسین راتیں۔ اللہ اللہ!۔"

رفتہ رفتہ کمپاؤنڈ خالی ہونے لگے!

وہ چونک پڑی۔ غفور میاں جو اس کے پرانے رکشہ والے تھے۔ اور اپنی مہربانی سے اسے لاتے لے جاتے تھے۔ جنھوں نے ان سب کے بیت الکریم آجانے کے بعد بھی ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ عافیہ کو کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔!

اسے اکیلے کھڑا رہنا خاصہ گراں گزر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد گھر پہونچنا چاہتی تھی۔! غفور میاں کا انتظار کب تک کرتی۔ شاید انہیں کوئی سواری دور کی مل گئی تھی۔!

اس نے ڈوپٹہ سے سر اور کان لپیٹے۔ اور گیٹ پر آئی۔! یہاں سے وہاں تک شیطان کی آنت کی سی لمبی سڑک تیز دھوپ میں چمک رہی تھی۔ بہت کم راہگیر چل پھر رہے تھے۔!

ایک رکشا فٹ پاتھ سے لگا کھڑا تھا۔! عافیہ کو وہی غنیمت معلوم ہوا۔ اس نے اسے آواز دی۔!

"کہاں جانا ہے؟" رکشے والے نے اسے اس طرح گھورا کہ عافیہ کو غصہ آگیا۔ پتہ بتاتے ہوئے اس نے کرایہ پوچھا۔

"اچھا اچھا۔ چلئے بیٹھ جائیے۔ دے دیجئے گا جو دل چاہے۔" رکشا اس کے قریب لاتا ہوا وہ بڑبڑایا۔ "بیٹ بڑا ظالم ہے سرکار۔ صبح سے اب تک کوئی سواری نہیں ملی۔ بچے گھر پر بھوک سے بلبلا رہے ہوں گے۔ گرمی نے

سچویشن سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ اس کی زبان سوکھ کر تالو سے چپکی جا رہی تھی !۔ کیا انجام ہونے والا ہے ؟۔

"شرافت سے نہ اتر دگی تو کھینچ لوں گا۔!" ابکی وہ بھینچی ہوئی آواز میں غرایا۔ لیکن وہ تو اپنی جگہ جم گئی تھی۔ ہزار چاہتی بھی تو حرکت نہ کر سکتی۔ اس نے رحم طلب انداز میں رکشے والے کی طرف دیکھا۔ اس نے رُخ پھیر لیا دفعتًا اس نے اپنے پیچھے کسی کار کی آواز سنی اور یکبارگی چیخی۔!

"خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔!" ایک آدمی کار کا دروازہ کھول کر قریب آیا۔ اسے دیکھ کر رکشے والا اور دوسرا بدمعاش پیچھے ہٹ گئے۔!

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا۔" کار کا مالک اس کے پاس آکھڑا ہوا اور تب ہکلا ہکلا کر عافیہ نے ماجرا بیان کیا۔!

کار کے مالک نے دانت پیس کر اور گھونسہ دکھا کر بدمعاشوں سے کہا۔" بھاگ جاؤ ورنہ دے دوں گا پولیس میں۔" پھر اس سے مخاطب ہوا۔" آئیے آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں پہنچا دوں گا آپ کو۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنے دولت خانے کا۔!"

"بیت الکریم۔" خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہوئے عافیہ نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ آیئے۔!"

عافیہ نے ایک، افتاد پڑنے پر جس طرح حواس کھو دیئے تھے۔ غیبی مدد مل جانے پر بھی کھو دیئے۔ سوچے سمجھے بغیر پچھلی نشست پر جا بیٹھی۔ اور کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سڑکوں کی پہچان مشکل ہو رہی تھی۔ عافیہ کے سینے میں پھر ہوا سمانے لگی اور آنکھوں میں رنگ برنگی دائرے ناچنے لگے۔! ایک دفعہ اس نے ہواؤں میں چیخ کر پوچھا تھا۔" یہ

کون سی جگہ ہے۔ آپ کو میرے گھر کا پتہ یاد ہے نا؟"
"بالکل بالکل۔" ڈرائیور کی نشست پر بیٹھے ہوئے ان صاحب نے جواب دیا۔ "آپ بے فکر رہئے۔ میں آپ کو قریب کے راستے سے لے جا رہا ہوں۔"
"قریب کا راستہ تو کار کے ذریعہ اور جلدی طے ہو جاتا۔" عافیہ نے کہا۔ "آپ نہیں جانتیں وہ مردود رکشے والا آپ کو اپنے مکان سے کتنی دُور لے گیا تھا۔"

"خدا کے لیے جلدی پہونچا دیجئے۔" عافیہ گڑگڑائی۔ اور اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتی ہوئی بولی: "دیکھئے ساڑھے تین بج رہے ہیں! میرے گھر میں سب پریشان ہوں گے۔"
"قدرتی بات ہے۔!"
اس آدمی کے مہذب لب و لہجہ سے عافیہ کو قدرے اطمینان ہو گیا تھا لیکن دل اب بھی کار کی رفتار سے زیادہ تیز دھڑک رہا تھا۔! وہ چپکے چپکے دعا مانگ رہی تھی۔ مالک کسی نئی مصیبت سے دوچار ہونے سے بچائے اور گھر پہونچا دے۔! اور پھر جب اس کی جانی بوجھی سڑک اور ایک روز کا دیکھا ہوا کیفے نظر آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی عافیہ نے شکر گزار انداز میں کہا:
"میں آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ آپ اگر نہ آجاتے تو پتہ نہیں وہ خبیث مجھے کہاں لے جاتے۔! آج کل کیسی عجیب دھاندلیاں ہو رہی ہیں
جواب دیئے بغیر ان صاحب نے ہاتھ پیچھے کر کے اسے چند چوکلیٹ دیئے اور نہایت نرم لہجہ میں بولے:
"انھیں کھائیے۔ بہت تقویت محسوس کریں گے۔ آپ کتنی پریشان ہو رہی تھی

رہی ہیں۔!"

ان صاحب نے بھی اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دو تین چوکلیٹ منہ میں رکھ لیے۔ عافیہ کی حلق یوں ہی خشک ہو رہی تھی! اور پھر اسے شبہ بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے شکریہ ادا کر کے چوکلیٹ منہ میں ڈال لیے۔ لمحہ بھر میں اسے محسوس ہوا جیسے واقعی اس جان لیوا گرمی میں ان چوکلیٹوں نے کسی قسم کے فرحت بخش مشروب کا کام کیا ہو۔! کیسا عجیب سا سرور تھا۔ وہ بے ارادہ اونگھنے لگی! اور دس ہی پانچ منٹ میں کار کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔! کار والے صاحب نے ایک نظر پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر گاڑی موڑ لی۔ جدھر سے کار آئی تھی اسی راستے پر پھر ہو لی۔ عافیہ پچھلی نشست پر پڑی بے خبر سو چکی تھی۔!

پانچ بجے شام تک عافیہ کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا گیا۔! کریمی صاحب رہ رہ کر گیٹ تک آتے اور واپس چلے جاتے۔ بیگم صاحبہ کی بے قراری ترقی پر تھی۔ عافیہ آج تک بتائے بغیر کہیں نہیں گئی تھی۔ اس کی کوئی ایسی سہیلی بھی نہ تھی۔ جس کے پاس وہ ٹھہر جاتی! بیرسٹر صاحب بھی ہمیشہ کی طرح وہاں موجود تھے۔ اور کریمی صاحب کو تسلی دے رہے تھے۔ کالج میں اس کا آخری دن ہے ممکن ہے اپنی ساتھی لڑکیوں میں گپ شپ کرنے بیٹھ گئی ہو۔!

تھوڑی دیر اور انتظار کیا گیا۔ حتیٰ کہ سرِ شام کا دھندلکا در و بام پر سیاہی بکھیرنے لگا۔! عافیہ کا اب بھی کوئی پتہ نہ تھا۔! ان لوگوں کی بیقراری اور کرب ترقی پر تھا! حمزہ دوڑا دوڑا ظہیر صاحب کے گھر گیا۔ وہاں تو وہ نہیں چلی گئی۔ پتہ چلا کہ وہ تو ہفتوں سے ظہیر صاحب کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ اس کی سسرال تھی۔ وہاں جاتے وہ شرماتی تھی۔ تو پھر۔ حمزہ واپسی میں غفور میاں

وہ طویل بیماری جس سے وہ صحت یاب ہوئے تھے۔ ان پر پھر عود کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھ رہے تھے۔

ساری رات انہیں امید رہی کہ عافیہ اب آئی کہ تب آئی۔ لیکن رات آہستہ آہستہ گزر گئی اور قریب کی مسجد سے موذن نے اللہ اکبر کی روح پرور صدا بلند کی۔ صبح ہو گئی۔

وہ اب بھی اس طرح بیٹھے تھے جیسے ان کے درمیان سے ابھی ابھی جنازہ اٹھا ہو حمزہ باہر چلا گیا۔

کریمی صاحب دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے۔ اور بے چاری بیگم یوں اپنے شوہر اور بیرسٹر صاحب کے چہرے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ مراقبہ کے ذریعہ کوئی نئی امید افزا خبر سنانے والے ہوں۔ لیکن وہ دونوں بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

کریمی صاحب پھر بستر سے کراہتے ہوئے اٹھے اور گیٹ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ بیرسٹر صاحب سے بیگم کریمی باتیں کر رہی تھیں اور آنسو بہا رہی تھیں۔ انھیں بس یہ صدمہ تھا کہ عافیہ باآبرو نہیں رہ گئی۔ نجانے کس بدمعاش کے ہتھے چڑھ گئی۔ کون اس کی تاک میں تھا۔

یہ بات ایسی حیا سوز تھی کہ بیرسٹر صاحب اس کا کچھ جواب نہ دے سکے۔

عافیہ کو رات کے کسی حصے میں ہوش آیا۔ پہلے تو اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں تھی۔ ابھی تک سر گرانی باقی تھی۔ اور دماغ میں ایسی سنسناہٹ

ہو رہی تھی جیسے وہ کسی ہوائی جہاز میں سوار ہو۔ وہ ایک گدّے پر پڑی تھی! اور اس کی آنکھوں کے عین سامنے ایک بلب روشن تھا، جو شیطان کی آنکھ کی طرح یوں جل رہا تھا کہ اس کی تکلیف دہ شعاع اس کے دماغ میں تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔!

"میں کہاں ہوں۔!" اس نے پاگلوں کی طرح سوچا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر پاگلوں ہی کی طرح اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالی۔ اور یکبارگی ذہن آئینہ کی مانند صاف ہو گیا۔! وہ کار ہی میں سو گئی تھی۔! باقی کا سفر کیسا گزرا تھا؟ وہ کون تھا۔ جس نے اسے ایک اجنبی جگہ پہنچا دیا تھا۔

ایک نہایت اذیت ناک خیال اسے آیا۔ اور اس نے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے خود کو اوپر سے نیچے تک ٹٹول کر دیکھا۔ اس کی غفلت اور بے ہوشی سے کسی نے فائدہ تو نہیں اٹھایا تھا۔

میرے خدا۔۔۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اس میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہ تھی۔ کیا وہ کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو چکی تھی۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔! آہستہ آہستہ پھر ساری صلاحیتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں۔ اب کیا ہوگا۔ یہ کیا ہوا۔۔۔ ذہن میں طوفان سے بپھر رہے تھے۔ اور آنسوؤں کا سوتا خشک ہو چکا تھا!۔ دل البتہ رگ رگ میں شور مچاتا اور سر ٹکراتا پھر رہا تھا۔

اب کیا ہوگا۔ اگر کوئی اندر گھس آیا۔ یا اللہ۔۔۔ اس میں تو مدافعت کی بھی طاقت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ایک تنکا تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ پھر جیسے جیسے دماغ کی دھند چھٹتی گئی۔ اس پر اپنی بدترین تباہ حالی

واضح ہوتی گئی۔ اور اب یہ عالم تھا کہ جیسے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ گویا ہر بن مُو سے آنسو جاری تھے۔ اسے اپنے ماں باپ یاد آرہے تھے۔ بھائی یاد آرہا تھا۔! ان کی تشویش اور پریشانی کا خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اور یہ خوف سب احساسات پر غالب تھا کہ اس کی گم شدگی کی اطلاع تقریباً سبھی کو ہو چکی ہو گی۔ پھر دفعتاً چشم تخیل نے دانش کی نفرت وحقارت سے معمور آنکھیں سامنے پیش کیں۔ اور ایک بار پھر اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔۔ اسی طرح باقی رات کٹی اور صبح کی آمد آمد کے ساتھ ہی ہزاروں اندیشے سامنے آموجود ہوئے۔! اب سچے دل سے اپنی فوری موت کی دعا مانگ رہی تھی۔!

دروازے کے اوپر بنی چوڑی جالیوں سے آفتاب کی نوخیز کرنیں جھانک رہی تھیں شعاعوں کے تیر سے دیوار پر پڑ رہے تھے۔!

وہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھی اور دیوار کا سہارا لیتی ہوئی دروازے تک آئی۔ سارا بدن بید مجنوں بنا ہوا تھا۔ ہر لحظہ یہی کھٹکا ہوتا کہ اب دروازہ کھلا اور اب کوئی شیطان سا پھر نظر آیا۔ لیکن دروازہ بند ہی رہا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بولٹ پر ہاتھ رکھا۔ اور دروازہ اپنی طرف کھینچا۔ لیکن مایوسی اور نامرادی نے اسے پھر پاتال میں گرا دیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب اسے خیال آیا۔ دروازہ کھولنے کی سعی کرنا حماقت تھی۔ بھلا وہ خبیث جو اسے لایا تھا اتنی معمولی سی احتیاطوں کو نظر انداز کر دیتا۔ دروازے پر سر رکھ کر وہ پھر آنسو بہانے لگی۔!

اب اسے اپنی بدبختی سے زیادہ ماں باپ کی بدحالی کا خیال آرہا تھا کیا حال ہوگا ان کا اگر وہ اس قفس سے رہا نہ ہو سکی۔!... خودکشی۔۔

دیر ہوگئی۔ اب دن کے دس بجے تھے۔ اور کمرے میں حبس ہونے لگا تھا۔ اس نے کسی امید پر پھر دروازے کو کھولنا چاہا۔ لیکن وہ نہ کھلے اس نے انہیں باہر ڈھکیلا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ وہ منحوس، دروازے باہر کی طرف کھلتے تھے۔!۔

پھر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ باہر کیسے نکلے؟ ایسا نہ ہو کہیں کوئی نگرانی کرتا ہو۔ اور دوبارہ پکڑ کے بند کر دے۔! ڈرتے ڈرتے اس نے باہر قدم رکھا! اور وحشی ہرنی کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھا۔! وہ ایک اجاڑ سے وسیع و عریض باغ میں کھڑی تھی، بلکہ باغ تو کیا۔ بے ترتیب سے گھنے درختوں نے اسے جنگل بنا رکھا تھا۔ زیادہ جائزہ لینا خطرناک تھا۔ اس نے تیزی سے ایک طرف قدم بڑھا دیئے۔ اب اسے دیوار کی پچھلی طرف ٹریفک کے گزرنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔! اس نے بے قرار نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں اور ایک طرف کی دیوار میں اچھی خاصی دراڑ دیکھ کر اس میں سے نکلی۔ اور سڑک پر آگئی۔! یہاں اس نے خود کو محفوظ دیکھا۔ اطمینان تھا کہ اگر کسی نے کچھ زیادتی کی تو شور مچا کر راہگیروں کو اکٹھا کر سکے گی۔ مگر کچھ نہ ہوا پھر اس نے کئی خالی رکشے اپنے سامنے سے گزرتے دیکھے مگر جان بوجھ کر کسی کو نہ بلایا۔ اب اس کی ہمت اور طاقت عود کر آئی تھی۔ بے اندازہ مسرّت تو اس بات کی تھی کہ اس کی عصمت و آبرو کا خزانہ محفوظ تھا۔

پھر اس نے بوڑھے اور کمزور سے رکشہ والے کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

رفتہ رفتہ اجنبی علاقہ پیچھے چھوٹتا چلا گیا۔ اس کا اپنا محلّہ دکھائی دیا اور وہ سڑک کے موڑ پر تھی جب اسے بیت الکریم کا خوشنما آسمانی رنگ کا

پھاٹک دکھائی دیا۔ ! پرس اس کے پاس تھا۔ بوڑھے کے ہاتھ پر دس کا ایک نوٹ رکھ کر اور اس کی حیرت کی پرواہ نہ کر کے وہ بے تحاشہ بھاگی اور اپنے پھاٹک میں داخل ہوگئی ۔!

قدموں کی آہٹ پر سب نے ایک ساتھ سر اٹھا کر دیکھا۔ اور یکبارگی سب بول پڑے۔

"عافیہ !۔" کریمی صاحب کے لبوں سے نکلا۔

"بیٹی ۔ !" امی نے کہا۔

"آپا۔ !" حمزہ بولا۔

"تم ۔ !" بیرسٹر صاحب بڑبڑائے

عجیب سی نظریں تھیں جو اس پر پڑ رہی تھیں۔ ان نظروں میں کیا تھا۔ تحیّر، استہزا، حقارت، ترحّم۔ ! کیا تھا ان متعدد نگاہوں میں۔

عافیہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ماں کی گود میں گر پڑی۔

بیرسٹر صاحب ہونٹ چبانے لگے۔ !۔

"کہاں تھیں بیٹی ۔" بیگم کریمی نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ "تم پر کیا گزری ؟ بیٹی تم "اچھی" تو ہو ۔ ؟"

کریمی صاحب سرد نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے ۔ انہوں نے اس کی آمد پر کسی پُرمسرت گرمجوشی کا اظہار نہ کیا ۔ بس اسے گھورتے رہے ۔ !

"آپا۔ آپ کسی سہیلی کے گھر رہ گئی تھیں کیا ۔؟" حمزہ بولا "آپ کو خیال نہ آیا کہ آپ کے اس طرح بے کہے سنے چلے جانے سے ہم سب کا کیا حال ہوگا ۔ ؟"

"حمزہ۔ جو ہوا وہ ہوگیا۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ وہ ساری رات

بہہیں رہے تھے۔ بولے "یہ سب بعد کو پوچھ لینا۔ رات سے سب کی بھوک پیاس بند ہے۔ اب کچھ بند و بست ناشتے کا کرنا چاہیے کیوں بھابی۔۔؟"

وہ خاموش رہیں۔ حمزہ اٹھ کر چلا گیا۔ شاید اسے ہوٹل سے کچھ سامان لانے کے لیے بیرسٹر صاحب نے بھیجا تھا۔! اور خود بھی اٹھ کر واش بیسن میں منھ دھونے لگے!۔

"عافیہ!" نہایت سرد لہجہ میں کریمی صاحب نے اسے مخاطب کیا۔

"جی ابا جان۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ اور سر جھکا کر آنسو پونچھنے لگی۔

"بتا دو صاف صاف۔ کیا گزری ہے تم پر۔؟" ان کا لہجہ ایسا تھا کہ عافیہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ کیسی خوں خوار لگ رہی تھیں ان کی وہ آنکھیں جن سے ہمیشہ محبت کا نور چھلکا کرتا تھا۔!

"ابا جان۔" عافیہ نے سسک کر کہا۔ "میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کیا کیا ہے۔ نجانے کس نے مجھ سے کیا دشمنی نکالی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی ابا جان۔ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"تمھیں کیا نہیں معلوم۔؟" وہ گرجے

بیرسٹر صاحب رومال سے چہرہ پونچھتے ہوئے آکر کرسی پر ٹک گئے اور رفع شر کے لیے بولے:

"اگر یہ کسی بدمعاش کی بے ہودگی ہے تو واقعی اس میں عافیہ کی کیا خطا ہے۔ تمہارا یہ لہجہ اسے مار نہ ڈالے گا۔!"

"بیرسٹر صاحب۔" وہ پھر سسکنے لگی۔ "ابا جان کو سمجھائیے۔ میں بے قصور ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بلا کم و کاست ساری سرگزشت سنا دی۔

مگر کریمی صاحب کو یقین نہ آیا۔ وہ یہی کہے گئے۔ "میں اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا۔ کل رات سے اب تک اپنی بے قراری کے مارے تقریباً سارے پڑوسیوں کو اس بدترین راز میں شریک کر چکا ہوں۔ دو تین حضرات نے تو مغویہ لڑکی کا پرسہ بھی دیا تھا۔ اب میں اس محلہ میں کیوں کر رہ سکوں گا۔ کیسے سب کو صورت دکھاؤں گا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ان حضرت کی لڑکی ساری رات کہیں باہر گزار کر آئی ہے۔ نہیں نہیں۔ شرمندگی کے اس جینے سے میرا مر جانا بھلا۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔!

"ناصر بھائی۔ تم کچھ سٹھیا گئے ہو کیا۔؟" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ اور انہیں کندھوں سے تھام کر پھر بٹھا دیا۔ بیگم کریمی دم بخود سی شوہر کا چہرہ تک رہی تھیں۔

دفعتاً کسی نے کال بل بجائی۔ حمزہ باہر سے آتا ہوا نہایت ناخوش گوار لہجے میں بولا۔ "ہمسائے کے ریڈیو آرٹسٹ صاحب ہیں۔ دریافت فرما رہے ہیں کہ گمشدہ لڑکی گھر واپس آئی کہ نہیں۔ خدا غارت کرے۔ یہ بات مشہور کیسے ہو گئی۔ رات کی رات میں۔ ابا جان آپ کو کسی سے کہنا نہیں چاہیئے تھا!"

اتنے میں ایک معمر سی محترمہ صحن میں دکھائی دیں۔ ان کی نظروں کے سامنے بڑا انوکھا مگر وسیع افواہوں کو پھیلانے والا سین تھا۔ مرد گم صم خواتین شرمسار۔ کچھ پوچھے بغیر بڑی بی سارا معاملہ سمجھ گئیں پھر بولیں "اے بہن۔ سنا تھا کہ لڑکی رات گھر نہیں آئی۔ اس کا کوئی پتہ چلا؟"

"جی ہاں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "وہ رات ہی کو آ گئی تھی۔ اپنی خالہ کے گھر رہ گئی تھی۔!"

"مگر منجھلے میاں نے تو اسے کچھ دیر قبل رکشے سے اترتے دیکھا تھا۔!"
"لڑکی مرچکی ہے۔" اچانک کریمی صاحب دھاڑے۔ "اور آپ دفع ہو جائیے یہاں سے۔!"

وہ تو بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ کریمی صاحب نے سر تھام لیا۔
"آپ نے اسے ناحق ڈانٹا اب وہ سارے میں بدنام کرتی پھرے گی
بیگم کے منھ سے اتنا نکلنا غضب ہو گیا۔ کریمی صاحب آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔ جو کچھ منھ میں آیا، کہدیا۔ بیرسٹر صاحب کی بھی ایک نہ سنی۔ سب دم بخود بیٹھے رہے۔

اور پھر ایک قیامت اور آئی۔ اچانک ظہیر صاحب اور ان کی بیوی پرسش احوال کے لیے آگئے۔ ظہیر صاحب تو کچھ گم تھے مگر ان کی بیوی کے چہرے پر زلزلے کے پورے آثار موجود تھے۔ کسی رسمی سی علیک سلیک کی بھی انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی اور بولیں۔ "ارے میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے جب میں نے سنا کہ لڑکی دیر گئے تک گھر نہیں لوٹی۔ آج کل زمانہ اتنا خراب ہے کہ بس گھر سے نکلنے کے بعد گھر پہونچے پہونچے تک اللہ اللہ ہی منانا چاہیئے۔ ٹکریں الگ ہوتی ہیں۔ لڑکیاں الگ بھگائی جاتی ہیں۔ پھر ان کا کیا ٹھیک۔ کیسی رہیں کیسی نہ رہیں۔ تب تو تالاب کنٹے ہی میں پناہ ملتی ہے۔ ہائے کیا خبر تھی کہ اپنی بچی پر یہ افتاد پڑے گی۔ خدا نہ کرے کہ ــــ!"
"بات کو سمجھا کرو۔" ظہیر صاحب بولے۔ "وہ چلی آئی ہے۔ بس اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ تم نجانے اپنی بکواس کے دھن میں ــ!"
"نہیں بھابی۔ آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔" کریمی صاحب نے کہا

"ایسی لڑکیوں کا ٹھکانہ بس کنویں کھائی کی تہہ ہے۔ وہ لاکھ اچھی ہوں۔ مگر زمانہ پھر انھیں پاک نہیں سمجھتا۔ یہ داغ ایسا ہے کہ موت بھی اسے دھو کا نہیں دے سکتی سب یہی کہتے ہیں وہ سیاہ تھی۔ موت کی گود میں چھپ گئی۔ اُف میرے مالک! مجھے یہ دن دیکھنا تھا۔ اتنی مصیبتیں مجھ پر کم تھیں خداوندا تو نے ایسی شرم ناک آزمائش میں مجھے مبتلا کر دیا۔"

عافیہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے مزید نہیں سنا کہ اس کی ہونے والی خوشدامن نے اور کیا کہا۔؟

بھوکی پیاسی وہ اندر بند تھی۔ اب ظہیر صاحب کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کریمی صاحب البتہ کہہ رہے تھے:

"دیکھ لیا تم نے خیر النساء۔ اب بتاؤ۔ میں حق بجانب تھا کہ نہیں۔ ایسی لڑکی کو کوئی نہیں قبول کرتا۔ سنا تم نے۔ دانش کے آنے میں ایک طویل عرصہ باقی ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ آنے کے بعد اس کے کیا خیالات ہوں؟ اس کی والدہ اسے ان تمام حالات سے آگاہ کر دیں گی۔ تب کیا وہ ہماری لڑکی سے بیاہ کرنے پر آمادہ ہوگا؟۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اور پھر میں خود بھی گوارا نہ کروں گا کہ دانش سے اس کو بیاہوں اور ساری عمر شرمندگی کا زہر پیتا رہوں۔ اب تو میں خود زہر کھاؤں گا اور اسے بھی زہر دوں گا۔!"

"ارے آپ کو ہوا کیا ہے۔" بیگم خوفزدہ ہو کر بولیں۔ "وہ تو قسمیں کھا رہی ہے کہ — !"

"تم پاگل ہوگئی ہو۔ تمہارے حواس مختل ہو چکے ہیں۔" کریمی صاحب پھٹ پڑے۔ "یا تم نے شرم و حیا بھون کھائی ہے۔ ارے سب سے پہلے تو تم ہی دونوں کو فرطِ غیرت سے مر جانا چاہئے تھا تم اس کی وکالت کر رہی ہو

تم کہتی ہو کہ وہ بدستور پہلے کی سی ہے۔ مگر کیا تم ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر یہی بات باور کراتی رہو گی۔ تم کسی سے نظریں چار کر سکتی ہو۔ ارے سارے محلہ میں تو تم ہم سب بدنام ہو چکے۔ اب کیا باقی رہا ہے۔ کیا تم میں سر اٹھا کر چلنے کی ہمت ہے۔ لوگ انگشت نمائی نہ کریں گے۔ وہ جا رہی ہیں محترمہ جن کی لڑکی ـــ!"

"چپ رہئے۔ حواس تو آپ کے گم ہیں۔" وہ بھی چیخیں۔ "کوئی کچھ نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ شرمناک الزام آپ خود اپنی لڑکی پر لگا رہے ہیں۔ لوگ کل تک یہ بھول جائیں گے۔ کیا کسی کے پاس ان کے اپنے دکھ اور مسائل نہیں ہیں کہ وہ بس ہماری ہی غیبت کیا کریں؟"

عافیہ اپنے کمرہ میں بند تھی۔ ایک ہی رات کے عرصہ میں اس کی قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا تھا وہ حیران تھی۔ کیا قصور کیا تھا اس نے؟ کیوں اس کا چاہنے والا باپ اُسے غلاظت کا ڈھیر سمجھنے لگا تھا۔؟ وہ سراسیمہ تھی اب کیا ہو گا۔ اگر دانش نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا اس طرح بھی تقدیر بدلتی ہے۔ وہ زندگی گزارنے کے دل کش سہارے کیا ہوئے۔ اس میں اور دانش میں ہزاروں کوس کا فاصلہ ہو گیا۔! اب کیا ہو گا؟

بیگم کریمی نے اس کو سینے سے لگا کر تسلیاں دی تھیں اور پوچھا تھا کہ وہ سب کچھ سچ سچ کہہ دے۔ اس کے پاس کہنے کو تھا ہی کیا؟ جو کچھ گزری تھی اس نے بیان کر دیا۔ ماں کو تو بیٹی پر یقین آگیا مگر باپ کو نہ آیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ بے ہوشی کا کیا مطلب تھا۔ اسے بے ہوش کیوں کر دیا گیا تھا؟ بیرسٹر صاحب نے قانونی نکتہ نکالا۔ "تم نے ان بدمعاشوں کی شکلیں اچھی طرح دیکھی تھیں۔ دوبارہ دیکھو گی تو پہچان سکو گی۔؟"

بیرسٹر صاحب کا ضبط رخصت ہو گیا۔ ! انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور ایک سسکی لے کر اس کی مانگ پر اپنے لب رکھ دیئے۔!

اور اسی شام کو اس کا نکاح بیرسٹر صاحب سے ہو گیا۔ وہ اسے لے کر اپنی کوٹھی چلے گئے۔ ! بیگم کریمی بس سوکھی سوکھی سانسیں لیتی رہیں انہوں نے اس بے جوڑ سے نکاح پر کوئی احتجاج نہ کیا۔ شاید کریمی صاحب کے استدلال کی گہرائی ان پر واضح ہو چکی تھی !۔ کب تک عافیہ ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ کل کس نے دیکھا تھا۔ اگر دانش اس سے شادی نہ کرتا تو پھر کیا ہوتا۔ بیرسٹر صاحب انہیں معقول ترین انسان معلوم ہوئے۔ !

چپ چپاتے عافیہ رخصت ہو گئی۔ کریمی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دئے تھے۔ "بیٹی مجھے معاف کر دو۔ یہ سب مجبوری کی بات ہے۔ تقدیر کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ میں نے تمہارے حق میں بہتری کی بے بہری کی۔ مجھے ظالم اور بے انصاف نہ سمجھنا۔ جاؤ، خدا تمہیں خوش رکھے۔"

بیگم کریمی نے عافیہ کے تمام ملبوسات اور زیورات اسے دینا چاہے تھے تب بیرسٹر صاحب نے کہا تھا:

"یہ سب رہنے دیجئے۔ عافیہ کے لیے میرے پاس کمی کیا ہے؟"

کریمی صاحب کے دل پر جو دھکا لگا تھا۔ وہ بہت زبردست تھا۔ عافیہ کے جانے کے بعد شدید پچھتاوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ خود کو سمجھا نہ سکے۔ کسی کا کوئی دلاسہ تسلی ان کے کام نہ آیا۔ وہ بس روتے رہے اور ایک رات ایسے سوئے کہ پھر نہ جاگے !۔

بیگم کریمی کی دنیا اندھیر ہو گئی !۔ اب ان کے لیے یہاں کیا رکھا تھا

عافیہ نے مبہوت ہو کر اپنی خواب گاہ دیکھی۔! بیت الکریم کی اس کی اپنی خواب گاہ کے مقابلہ میں یہ جگہ کسی مغل بادشاہ کی حرم سرا معلوم ہوتی تھی۔ جدھر نظر جاتی عیش و آرام، امارت و تمول کے مظاہر نظر آتے! یہ مسہری، تپائی، دیوار سے لگا ہوا بھاری بھر کم دیوان۔ چھت میں آویزاں جھلمل جھلمل کرتا خوش نما فانوس، سنگار میز۔ اور نجانے کیا کچھ وہاں تھا
عافیہ نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنا گھومتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا
خود کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ یہ سب ایک وحشت ناک خواب ہے طویل خواب۔ ابھی اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ اور وہ خود کو اپنے گھر میں اپنے بستر پر سوتا ہوا پائے گی۔ بیرسٹر صاحب کا دیو ہیکل وجود۔ ان کی گونجدار آواز۔ ان کی مخصوص خوشبو اس خواب ہی کا ایک حصہ ہے!۔
یہ خواب ابھی ٹوٹ جائے گا۔ ابھی۔ فوراً۔!
اور خواب ٹوٹ گیا۔

"عافیہ!۔" ایک بھاری گرم ہاتھ اس کے کندھے پر آکر رکا اور وہ دھک دھک کرتے دل کو قابو میں کر کے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔! کچھ دیر تک دیوانوں کی طرح انھیں دیکھتی رہی۔ پھر ایک مکروہ، ناپسندیدہ حقیقت کو سامنے دیکھ کر سر جھکا لیا۔!

"عافیہ۔!" عجیب سا شہد بھرا لہجہ تھا۔ جیسے یہ نام پکارنے والے کی زبان پر دیر پا لذّت چھوڑ جاتا ہو۔
"جی۔!" اس نے معصوم آنکھیں کھولیں۔!
"گھبرا رہی ہو۔؟" وہ سامنے بیٹھے تھے۔ اور اپنے سے اس قدر قریب کچھ زیادہ بھاری بھر کم لگ رہے تھے۔! عافیہ کے شاخِ گل کے سے بدن پر کپکپی

بیرسٹر صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ دو لمحوں تک حیران نظروں سے اُسے تکتے رہے پھر وہ مسکرائے اور آگے جھک کر پھولوں کے ڈھیر کی طرح عافیہ کو اپنی آغوش میں گرا لیا۔ اور بے حد محبت پاش انداز میں اس کا نرم و نازک چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولے :۔

"میرے بارے میں یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ میں تمھیں خدا نخواستہ بے آبرو سمجھ کر اٹھا لایا ہوں۔ یا میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے! نہیں عافیہ۔ میں بخدا تمھیں ہر طرح باعصمت باعزت سمجھتا ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ یہ تجویز کہ تم کو مجھ سے وابستہ کر دیا گیا۔ میری نہیں تھی۔ مرحوم نے!"
عافیہ سنبھل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ اور آنسو پونچھتی ہوئی بولی :

"اگر آپ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نے کہا ہے تو پھر شاید میری زندگی آسان گزر جائے۔!"

"آسان۔؟" وہ مسکرائے۔ "تمھاری زندگی شاہانہ انداز سے گزرے گی۔ اپنے پیار میں میں تمہیں نہلا دوں گا۔ وہ سامان عیش و راحت جو لازمۂ حیات ہے۔ میں تمھارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ تمھارے سوا اب میرا کون ہے۔ میری سرمایہ دولت اب تمھاری ہو گی۔ میں تمھارا ہوں۔ عافیہ۔ جو ہوا وہ ہو چکا۔! اب تم محسوس کرو گی کہ تقدیر کا وہ موڑ جو تمھارے سامنے آیا تھا اسی لیے آیا تھا کہ تم کو ایک بہترین شاہراہِ حیات پر گامزن کر دے۔ بعض حالات بظاہر ہولناک اور صبر آزما لگتے ہیں۔ لیکن بعد کو وہ بہت عمدہ اور خوش گوار ثابت ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ پرانی یادوں اور ان یادوں سے وابستہ محبت کا کانٹا دل میں کھٹکتا نہ رہے۔!"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔؟" وہ خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھنے

لگی۔ وہ بھی اسی کو دیکھتے رہے تھے۔ عجیب سے والہانہ انداز میں۔ جیسے نظروں نظروں میں اسے دل میں اتار لیں گے۔

"بہت پیاری ہو۔ بہت حسین ہو۔ سوچتا ہوں۔ تمھاری پرستش مجھ سے ہو بھی سکے گی کہ نہیں۔ ۔ !"

ہُنہ۔ اس عمر میں یہ چونچلے۔ وہ پھر جل گئی۔ اور خشک لہجے میں بولی:

"آپ یہ بتائیے کہ آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"تم نے تو کہہ دیا تھا کہ پرانی باتیں مت کیجئے۔ بھولے سے میری زبان سے ایک نامناسب بات نکل گئی تھی۔ اسے معاف کردو۔ !"

جس قدر وہ نیازمندی اور خاکساری کا اظہار کر رہے تھے اسی قدر عافیہ کا غصہ ترقی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے بے حد رکھائی اور کسی قدر تلخی سے کہا "آپ نہ بتائیے تو کیا۔ میں سمجھ گئی آپ کا مطلب۔ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میرے دل سے دانش کی یاد نہ نکلے گی۔ دانش کی یاد و الفت کا کانٹا ہر دل میں کھٹکا کرے گا۔ اور یہ پھانس ایسی ہو گی جو آپ کے دل میں بھی چبھتی رہیگی مگر بیرسٹر صاحب۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ اگر حالات نے مجھے دانش کے حوالے کر دیا ہوتا تو میں پوری وفاداری سے انہیں اپنے جسم و جان کا مالک مان لیتی۔ لیکن جو آدمی کسی گرے ہوئے کو اٹھا نہ سکے۔ اسے بدنامی و رسوائی کے ڈھیر پر پڑا چھوڑ دے۔ اس سے نفرت بے شک کی جا سکتی ہے۔ محبت نہیں۔ اور آپ۔ آپ تو دیوتا ہیں۔ آپ نے میرا ہاتھ تھاما ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ تحفظ دیا ہے۔ تو پھر خدا بہتر گواہ ہے کہ اب آپ کے سوا کسی کی یاد و محبت میرے دل میں نہیں ہے۔ آپ میرے مالک میرے آقا ہیں۔ میں کسی کی محبت کے ساتھ وفاداری اور آپ کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی! ۔"

" اوہ عافیہ۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" ان کی ساری وکالت عافیہ کی باتوں کے آگے سر بیٹتی دکھائی دی۔ بالکل ایسا لگتا تھا۔ جیسے ناطقہ سر بگریباں والا مضمون ہو۔ انہوں نے ہار کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولے:

"میں سمجھتا ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ جو تم کہہ رہی ہو۔ سب سچ ہے۔ میں آئندہ کبھی کوئی بات ایسی نہ کہوں گا جس سے تمہاری دل شکنی کا پہلو نکلے! بس اس بات کو یہیں ختم کر دو۔!"

وہ زہریلی سی ہنسی ہنس دی۔

" ختم کر دی۔!" اور ان کی تپش انگیز نظروں سے گھبرا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔!

"تمھیں نیند آرہی ہے۔؟" انہوں نے بڑے دلار سے پوچھا۔ عافیہ نے چپکے سے نفی میں سر ہلایا۔

بیرسٹر صاحب نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ "ایک بجنے والا ہے۔ اب تم آرام کرو۔ بہت تھک گئی ہو آج۔! میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ صبح ناشتہ پر ملیں گے۔ شب بخیر۔!" پھر وہ جھکے اور اس کی سونی سونی مانگ پر اپنے لب رکھ دیئے اور اس کے کندھے پر تھپکی دے کر خوابگاہ سے چلے گئے۔!

عافیہ تھوڑی دیر تک گم سی بیٹھی رہی۔ پھر جب بیرسٹر صاحب کے بھاری قدموں کی آہٹیں آنی بند ہوگئیں۔ تب وہ اٹھی۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے بولٹ کیا۔ اور لباس تبدیل کر کے دیوار سے لگے دیوان پر آبیٹھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ دماغ میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی!

جا چکی تھی۔!

بیرسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولے:

"رات آرام سے نیند آئی تھی۔؟"

"جی ہاں۔!"

"بھئی۔ اب تو تکلف اور حجاب اٹھاؤ۔ میں تمہارے لیے نیا تو نہیں ہوں مدتوں سے جانتی ہو۔!" انہوں نے کہا۔

"آپ کی یہ حیثیت تو نئی ہے۔!" عافیہ بولی۔ اس جواب نے بیرسٹر صاحب کو بے حد خوش کر دیا۔ ہنستے رہے۔!

"آؤ چلو۔ میں تمھیں اپنا گھر دکھاؤں۔ پھر تب تک ناشتہ بھی لگ جائیگا۔"

وہ اُسے اِدھر اُدھر لیے لیے پھرے، عافیہ جو رفتہ رفتہ بے تکلف اور کسی قدر بے حس ہوتی جا رہی تھی۔! ایک ایک چیز کی تعریف کرتی گئی۔! پھر دونوں باغ کے سامنے کھلے برآمدے میں آکھڑے ہوئے۔

"بہت پیارے گلاب ہیں۔!" عافیہ کے منھ سے نکلا۔ اس کی نظروں کے سامنے نہایت شان دار اور وسیع و عریض باغ تھا۔ باغبان کمر کسے ہاتھوں میں بڑے بڑے گراس کٹر اور جھرنے لیے پودوں کو تراشتے اور سیراب کرتے پھر رہے تھے۔! سبزے اور پھولوں کی خوشبو سے برآمدہ مہک رہا تھا

"بیٹھ جاؤ۔ عافیہ۔" انہوں نے ایک کرسی کھینچی اور منڈیر سے لگا دی۔ خود منڈیر سے ٹک گئے۔!

"اتنے بڑے گھر میں آپ اکیلے رہتے تھے۔؟" عافیہ نے تعجب سے پوچھا

"ہاں۔ بڑی وحشت ہوتی تھی۔ اسی لیے تو اپنا زیادہ وقت تمہارے

"بس انہیں پڑھا کرنا۔" انہوں نے کہا۔ "مجھے پتہ تھا کہ تم ان دو فن کاروں کو بہت پسند کرتی ہو۔ لہذا ___!"

"کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔ "میری پسندیدہ کتب آپ نے اپنے یہاں کیوں اکٹھا کر رکھی تھیں۔"

"بس۔ سوچتا تھا کہ اگر کبھی تم غریب خانے پر آؤ گی تو ___!"

ملازم نے دخل دیا۔ "سرکار۔ ناشتہ لگا دیا۔!"

"آؤ چلیں۔" وہ اسے ڈائننگ روم میں لے گئے! طعام خانہ بھی ان کے تمول کا آئینہ دار تھا۔ مجلّی الماریوں میں بہترین کراکری نظر آ رہی تھی ہوا دار بڑا سا کمرہ۔ باغ کی طرف بڑے بڑے دریچے کھلے ہوئے تھے۔ درمیان میں لمبی سی میز بچھی ہوئی تھی۔ اور ناشتہ کے نام سے نجانے کیا کچھ میز پر چُنا ہوا تھا۔

اس کی خاطر میں بیرسٹر صاحب بچھے جا رہے تھے۔ ایک ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھ رہے تھے اور خدا جانے کیا باتیں چھیڑ رکھی تھیں!

اور اس وقت عافیہ کے دل پر خواہ مخواہ اداسی کے بادل چھا گئے اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ باغ عامہ کا وہ فردوس نظر گوشہ ___ دانش کی یاد۔ ان کے ساتھ آخری بار کھانا پینا۔ وہ آخری ملاقات ___ اسے ان کا لمس یاد آیا۔ اور وہ کہیں کھو گئی۔

"کیا سوچنے لگیں عافیہ۔!" بیرسٹر صاحب کی بھاری آواز نے اسے پھر سنگلاخ دنیا میں واپس بلا لیا۔ وہ غور سے اس کا چہرہ تک رہے تھے۔

"سنو"

"جی!" اس نے ایک ادھوری سانس لی۔

اسی مناسبت سے تھا۔ اسفید کھچڑی بالوں سے لبریز سر، چوڑا چکلا چہرہ ابابیل کے گھونسلے کی سی خوفناک مونچھیں۔ زبردست ہاتھ پیر۔ بھونپو کی سی آواز۔ اور سب پر مستزاد ان کی عمر۔ وہ تو ساٹھ کے قریب پہونچ رہے تھے۔ اور وہ خود تھی انیس برس کی۔ تقدیر کے اس ظالمانہ مذاق پر اسے رونا آگیا۔!

اور پھر دانش کی یاد نے دل میں ایک چٹکی سی لی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا۔ وہ اسے یاد نہیں آتے۔ لیکن یاد کی چبھن غیر اختیاری بات تھی۔ وہ اپنے دل کا گوشہ گوشہ ٹٹولتی۔ ہر جگہ چپے چپے پر یہاں وہاں ہر طرف دانش کی محبت کے مرجھائے ہوئے پھول بکھرے پڑے تھے۔ جن کی اداس کر دینے والی مہک اس کی زندگی میں رچی بسی تھی۔ اور یہ زندگی کی آخری سانسوں تک مرنے والی نہ تھی۔ تو پھر بیرسٹر صاحب کا جان لیوا ساتھ ۔ ابھی تو وہ اس کا دل بہلا رہے ہیں۔ چوں کہ وہ کافی منتشر رہ چکی ہے۔ لیکن کل ۔ وہ اپنے جائز حقوق کی پابجائی کے لیے اسے مجبور کریں گے۔ اور تب ۔ تب .... اس نے لرز کر ان کی طرف دیکھا دل سے ایک غبار سا اٹھا۔ اور اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔!

"پروردگار! جو موت مجھے ایک دن آئے گی وہ ابھی کیوں نہیں آجاتی!"

ملازم جو کافی پہونچا گیا تھا۔ بار بار ان کے ٹیلی فون کال کی خبریں لا رہا تھا۔ دن گرم ہونے لگا تھا۔! دھوپ کی خیرگی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔

وہ نیچے آئے۔ اور پھر جاتے جاتے بولے:

"میں شام کو جلدی چلا آؤں گا۔ تیار رہنا۔ ہم شوپنگ کے لیے چلیں گے

اور سنو عافیہ۔ اب یہ گھر تمہارا ہے۔ جو کمرہ تم اپنی مرضی اور پسند سے درست کروانا چاہو۔ ملازموں سے کہہ دینا۔ ٹھیک کر دیں گے۔ تم خود کسی کام میں ہاتھ نہ لگانا۔ تھک مت جانا۔!"

"مجھے تو سب کمرے پہلے ہی سے درست لگ رہے ہیں۔!" وہ بیدلی سے بولی۔

"تمھاری مرضی۔" انہوں نے نہایت نیاز مندی سے کہا۔ "میں چاہتا تھا کہ کوئی الگ تھلگ کمرہ ہوتا جہاں تم آرام اور اطمینان سے بیٹھ کر کتب بینی کر سکتیں۔ اگر تمھاری کوئی سہیلیاں آئیں تو تم ــــ!" عافیہ نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا۔ مزید بکواس سننا نہیں چاہتی تھی۔! اور یہ بھی اسے پسند نہ تھا کہ اسے ان پر اس حد تک غصہ آجائے کہ وہ پھٹ پڑے۔ نیاز مندی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ آخر یہ اپنی اور اس کی عمریں کیوں بھول جاتے رہیں۔!

پھر اسے یہ ہدایت کر کے کہ وہ پچھلی باتیں نہ سوچے۔ دل نہ دکھائے اور آرام کرے۔ وہ چلے گئے۔!

اب گھر بھر میں روح فرسا سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ ملازم جن کے ذمہ کچن کا کام تھا۔ کچن میں مصروف تھے۔ ملازم عورتیں مشین کی طرح خاموش اور بے آواز دالان اور کمروں کی جھاڑ پونچھ کرتی پھر رہی تھیں۔ ایک لڑکا الماریوں اور دریچوں کے شیشے صاف کر رہا تھا۔!

آہستہ آہستہ وسیع و عریض صحن میں تیز دھوپ پھیل گئی۔!

اسے برآمدے والا بڑا ہوادار کمرہ پسند آیا تھا۔ اس کے متصل لائبریری بھی تھی۔ اب تقریباً گھر بھر کی کنجیاں بیرسٹر صاحب اسے

"میں ذرا۔ ہسپتال سے بول رہا ہوں۔" وہ ہکلا گئے۔

"کیوں۔؟"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج میں ہائی کورٹ میں۔ مطلب یہ کہ۔ دوسری منزل سے اتر رہا تھا۔ دفعتہً چکر آیا اور پتہ نہیں کیسے میں کئی زینوں سے نیچے آرہا۔ ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ مجھے تو پتہ بھی نہ چلا کب اور کیسے دوسرے ساتھی طبی امداد کے لیے یہاں لے آئے ہیں۔ فکر مت کرو۔ میں شرمندہ ہوں کہ وعدے کے مطابق گھر نہ آسکا۔ انشاء اللہ صبح کو آؤں گا۔ گھبرانا مت۔ اگر تمہیں اکیلے سوتے وحشت ہو تو افسری کو خواب گاہ میں سلا لینا۔ پریشان مت ہونا۔ اچھا شب بخیر!"

وہ سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سے چونکی۔! لیکن کچھ نہ بولی۔ اور ریسیور اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ پھر وہیں کھڑی رہ گئی۔ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "بیگم صاحب۔ آپ نے نہیں پوچھا۔ سرکار کون سے ہسپتال سے بول رہے ہیں۔"

"نہیں۔ کیوں؟"

"آپ جا کے انھیں دیکھ آتیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ وہ صبح آجائیں گے۔!" عافیہ نے سرد لہجہ میں کہا۔ اور اپنے کمرے میں آگئی۔

ملازمہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ بیگم صاحب کو قطعی تشویش نہیں۔۔۔ ہسپتال کا نام تک نہ پوچھا۔۔۔

عافیہ آکر مسہری پر گر گئی۔ اسے اپنے حالات پر شدت سے غصہ آرہا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ قسمت ایسے عجیب عجیب مذاق کرتی۔ کیا یہ ستم سہنے

کے لیے دنیا میں وہی اکیلی رہ گئی تھی ۔۔ ؟ اس کا جی چاہ رہا تھا اس سارے کارخانے کو آگ دکھا دے اور خود کہیں نکل بھاگے ۔۔ لعنت، لعنت اس کا ذہن چلا رہا تھا۔ اب کیا مقدر میں کچھ اور لکھا ہے۔ ! ابھی نجات نہیں ہوئی !۔

اب پھر وہی سناٹا تھا اور وہی شام کا افسردہ کن دھندلکا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کچھ کھا کر سو رہے اور ہمیشہ کے لیے اس عذاب سے نجات حاصل کرلے۔ !

ملازمہ رات کا کھانا لائی۔ ! لیکن اس نے صرف آدھی پیالی سوپ لیا اور پوری ٹرالی واپس کردی۔ کوٹھی کی بہت پرانی نگراں کار افسر کی شاید اس کے کسی حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ مگر عافیہ اس سے بھی مخاطب نہیں ہوئی اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا اور اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے بستر پر آ لیٹی۔ !

ساری رات سوتے جاگتے گزری اور ابھی وہ غسل خانے سے نکل کر ہیر ڈرائیر سے بال خشک کر رہی تھی کہ بیرسٹر صاحب آ گئے۔ ! شوفر نے انہیں ایک طرف سے اور کسی دوسرے آدمی نے کمر سے سہارا دے رکھا تھا۔ بیرسٹر صاحب کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ گال ستے ہوئے، لب خشک اور بال پریشان۔ وہ عمر سے کہیں بوڑھے نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو گئے ہوں۔ !

بیگم صاحب کو دیکھ کر شوفر اور وہ دوسرا شخص مؤدب ہو گئے۔ !

مجھے میری خواب گاہ میں پہونچا دو۔ !" بیرسٹر صاحب نے کراہتے ہوئے کہا۔ " بیٹھ میں سخت تکلیف محسوس کر رہا ہوں ! اُف۔ اُف !"

جہازی سائز کے ہاتھوں میں اس کا ننھا سا سرد ہاتھ دبالیا۔ عافیہ نے محسوس کیا۔ ان کی انگلیاں برف ہو رہی تھیں۔ اس نے متاثر ہو کر پوچھا:

"کچھ کہیے۔ میں آپ کا یہ درد کیسے کم کر سکتی ہوں۔"

وہ کچھ نہ بولے۔ بس اسے دیکھتے ہی رہے۔

"عافیہ۔!"

"جی۔!"

"عافیہ!۔ تم۔ اب۔!" اور بے معنی سے الفاظ بول کر پھر چپ ہو گئے۔!

"آپ کیسے گر پڑے، چکر آگیا تھا۔!" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے ایک غیر محسوس سی لی۔ "بلڈ پریشر کا مریض بھی تو ہوں۔ عرصے سے چیک نہ کرایا تھا۔! یہ دن دیکھا۔ آگیا تھا! دوسری منزل کے زینوں سے نیچے آرہا۔۔۔۔ اللہ۔ کیسے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو گیا ہوں۔"

"کوئی بڑا مقدمہ ہار گئے آپ؟"

"کاش۔ یہی ہوتا۔!" انہوں نے ایک طویل سانس لی اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے

وہ دن بھی عجیب تھا۔ بیرسٹر صاحب نے زبردستی اسے ناشتہ کرنے بھجوا دیا۔ اور خود کہنی آنکھوں پر ڈھک کر سوچنے لگے!

عافیہ الٹا سیدھا ناشتہ کر کے ان کے پاس آبیٹھی۔ آخر کو وہ اس کے شوہر تھے۔ خدمت اس پر فرض تھی من جانب اللہ۔

بیرسٹر صاحب بس سیدھے لیٹے تھے، کروٹ لینے کی کوشش کرتے

اور بیچ کر رہ جاتے۔ عافیہ نے انہیں پچکے پچکے کر کے کافی پلائی۔!

دن کے دو بجے نوکر نے کسی کال کی اطلاع دی۔

"کون ہے۔ فون پر۔!" انہوں نے پوچھا۔ "تم فون یہیں اٹھالاؤ۔"

ملازم ایک لمبے تار کے ذریعہ فون ان کے پاس لے آیا۔ ریسیور کان سے لگانے کے ساتھ ہی بیرسٹر صاحب کا چہرہ جو زرد ہو رہا تھا۔ یکبارگی سرخ ہو گیا۔! انہوں نے نہایت غیظ و غضب سے کہا۔ "تم جہاں ہو۔ بس وہیں رہو۔ یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں نہیں۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ خبردار۔ مت آنا۔ تمہاری یہی سزا ہے۔ شٹ اپ!" اور اس طرح ریسیور پھینکا کہ وہ دور جا گرا۔ پھر وہ بڑبڑائے۔ بدبخت، ناہنجار، بیٹھ بکواس کرنے لگی۔ پچھتا رہی ہوں ڈیڈی۔ ڈیڈی کی بچی۔ پہلے ہی ہوش نہ آیا۔ خدا غارت کرے۔!"

عافیہ چپ تھی۔ بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "تم پوچھ رہی تھیں آپ کی صاحبزادی کہاں ہیں۔ تو دیکھو کہ وہ آ رہی ہیں۔ نجانے کیا ہوا ہے۔ اس قسم کی خودسری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کم بخت۔ ماں کو بستر پر سسکتی چھوڑ کر چل دی تھی۔ پتہ نہیں۔ وہ بدمعاش کہاں ہے۔ بھاگ گیا ہوگا اسے منجدھار میں چھوڑ کر۔ لاحول ولا قوۃ ۔۔"

"انہیں آنے دیجئے نا۔ آپ نے منع کیوں کر دیا۔ انہیں بھی تو سہارا دینا آپ کا فرض ہے!۔" عافیہ نے کہا۔

"نہیں عافیہ۔ تمہاری بربادی۔ میری محتاجی۔ اس بخت کی تباہی یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔ تم سب بے قصور ہو۔ تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ بولے۔

شام تک بیرسٹر صاحب اس قابل ہو سکے کہ کروٹ لے سکتے۔ اس عرصہ میں دو مرتبہ ڈاکٹر آیا اور انھیں انجکشن دے گیا۔ وہ کسی قدر ٹھیک نظر آ رہے تھے۔! لیکن ان کے چہرے پر مُردنی اور عجیب قسم کی اداسی بدستور چھائی رہی۔ نجانے وہ اپنی تکلیف عافیہ سے چھپا رہے تھے یا کیا۔ بہرحال عافیہ کو بڑا بُرا الگ رہا تھا۔! کاش یہ صحت مند ہوتے۔ بے چارے صبح کو کتنے مسرور تھے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے۔ جو سورج صبح کو آب پر نکلتا ہے۔ پتہ نہیں وہ ڈوبتا کس طرح ہے۔؟

مغرب کا بڑا اُداس وقت تھا۔! تب اچانک کمپاؤنڈ میں کار کے رکنے کی زن زناہٹ سنائی دی۔ بیرسٹر صاحب اور عافیہ نے متفسرانہ نظروں سے دیکھا۔!

پھر اس کمرے سے باہر ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔!۔ "کون آ رہا ہے۔!" بیرسٹر صاحب بڑبڑائے۔ دوسرے لمحے پردے کے پیچھے سے ایک نسائی آواز نے کہا۔ "ڈیڈی! میں آ سکتی ہوں؟" اور اجازت کا انتظار کئے بغیر اندر آ گئی۔

"خدا کی مار۔!" بیرسٹر صاحب نے استکراہ سے کہا۔ پھر نہایت ناخوشگوار انداز میں بولے۔

"میں نے تم سے کہا تھا۔ یہاں مت آنا۔ اب مجھ سے تمہیں کیا سروکار ہے؟" انہوں نے عافیہ کا تعارف تک نہیں کرایا۔ اس نئی افتاد سے بہت دل برداشتہ تھے۔ فاخرہ کے بچے کا بے تحاشہ رونا چلانا انھیں نہایت گراں گزر رہا تھا۔ بالآخر وہ جھلا کر بولے

"اسے چپ کراؤ۔ میں بیمار ہوں۔ تم دیکھ نہیں رہیں۔!"

فاخرہ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اور بولی۔ "ڈیڈی آپ مجھ سے بہت ناراض لگتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یاد ہے تمہیں۔ اپنی ماں کو بستر مرگ پر چھوڑکر گھر سے بھاگی تھیں تم۔ دوسری صبح وہ تمہیں یاد کرتے کرتے ختم ہو گئیں۔"

"مجھ پر الزام مت لگائیے ڈیڈی۔ میں گھر سے بھاگی نہیں۔ آپ کو مطلع کر کے گئی تھی۔"

"تو پھر اب آئی کس سلسلے میں ہو؟"

"کیا میں اپنے گھر آ بھی نہیں سکتی؟"

"اب یہ گھر تمہارا نہیں ہے۔ سمجھیں؟۔" بیرسٹر صاحب نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ "اور میں پسند بھی نہیں کرتا کہ میرے دشمن کی بہو میرے گھر میں قیام کرے۔ تم براہِ کرم اپنے شوہر کے پاس جاؤ۔!" یہ کہہ کر انہوں نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ فاخرہ اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے جھوٹوں اس کے بچے کو نہیں دیکھا۔ فاخرہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔!

عافیہ نے ڈرتے ڈرتے کہا

"آپ تشریف رکھیئے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ کچھ دیر بعد آپ سے بات کر سکیں گے۔!"

"تم کون ہو۔ نرس ہو کوئی؟" فاخرہ نے حقارت سے پوچھا۔

"تمیز اختیار کرو۔ تمیز۔" بیرسٹر صاحب نے برہم ہو کر کہا۔ "تمہیں کچھ پوچھنے کا حق نہیں۔ تم جا سکتی ہو۔!"

"بہت اچھا۔!" وہ پھنکار کر پلٹی اور کمرے سے چلی گئی۔!

"آپ نے انہیں نکال کیوں دیا۔" عافیہ نے چپکے سے کہا۔ "شاید وہ سچ مچ آپ کی مدد کی محتاج ہوں۔"

"اس کی طرفداری نہ کرو۔ تم اسے نہیں جانتیں"۔ وہ بولے "محسوس نہیں کی اس کی خودسری۔ گستاخی۔ بے دردی۔ اس پر لعنت ہو۔ بے شرم کہیں کی۔ بچے کو دابے ہوئے آئی ہے۔ پناہ چاہتی ہے۔ ماں کے متعلق ایک بات بھی نہ پوچھی سنگدل نے۔ نہ ان کی یاد میں ایک آنسو اس کی آنکھ میں آیا۔ اوے۔ وہ تو شاید یہ دیکھنے آئی ہے کہ میں بھی مر گیا ہوں یا ابھی سانسیں لئے جا رہا ہوں۔!۔ ہونھ! نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔ ایک ٹھوکر کھانے کے بعد بھی میں اسے اپنا وارث بناؤں گا۔! اوے اب میرا جو کچھ بھی ہے وہ سب تمھارا ہے۔ اب میرا کوئی نہیں ہے دنیا میں تمھارے سوا۔!"

"آپ خواہ مخواہ ایسی باتیں سوچ رہے ہیں۔" عافیہ کو یقین تھا کہ چونکہ ان کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے لہٰذا دماغ تک اس کا کچھ ناگوار اثر ضرور پہونچا ہے۔ اس نے انہیں خاموش کر دیا۔ بیرسٹر صاحب تھک سے گئے تھے۔ یا پھر انہیں کوئی خیال آگیا تھا وہ سیدھے لیٹ گئے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ لئے اور کرب انگیز سانسیں لینے لگے۔ چند لمحوں بعد بولے: "عافیہ۔! تم اب جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرو۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔"

فاخرہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ مگر وہ گئی نہیں تھی۔ اس نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر باپ کی تمام باتیں سن لی تھیں اور پیچ و تاب کھا رہی تھی۔!۔ جب اس نے سنا کہ وہ لڑکی کمرے سے آ رہی ہے تو لپک کر کچن کی طرف ہو لی۔!

اسے دیکھ کر سارے ملازم جز بز ہو رہے تھے۔ کبھی اس نے ملازموں سے سیدھے منھ بات نہ کی تھی۔! ان پر مہربان نہیں رہی تھی۔!

"اے ۔۔!" اس نے ایک بوڑھے ملازم کو جھڑک کر مخاطب کیا۔" یہ جو لڑکی تمھارے مالک کے پہلو میں گھسی بیٹھی ہے۔ کون بلا ہے۔؟ کہاں سے آئی ہے؟۔"

بڈھے نے ایک مرتبہ خانساماں کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔: "صاحب زادی۔ وہ نئی مالکن ہیں۔!"

"نئی مالکن۔ کیا مطلب؟ تم کچھ سٹھیا تو نہیں گئے ہو۔"

"جی نہیں۔ صاحبزادی۔ ابھی کل ہی پرسوں تو سرکار نے ان سے شادی کر لی ہے۔"

"کیا۔؟" فاخرہ یوں اچھل پڑی جیسے اس کے سر پر چھت گر گئی ہو۔ "شادی کر لی ہے۔ اس عمر میں۔ اس چھوکری کے ساتھ۔ یہ کیسے ہوا۔ تم پہچانتے ہو۔ وہ کون لڑکی ہے۔ کہاں کی ہے۔؟"

"یہ سب جاننے کی ہماری کیا مجال ہے۔ صاحب زادی!" بڈھے نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "آپ کچھ پئیں گی۔ چائے بنا دوں۔ آپ کے صاحبزادے کے لیے دودھ۔!"

"بکواس بند کرو۔" فاخرہ چیخی۔ "یہ صاحب زادہ نہیں۔ بچی ہے اور تم اپنی مہربانیاں رہنے دو! افسری کہاں ہے؟ بلاؤ اسے!۔"

ملازم لڑکا افسری کو بلا لایا۔ وہ اندرونی کمروں کی صفائی کر رہی تھی کچن میں فاخرہ کو دیکھ کر متحیر رہ گئی۔!

"صاحب زادی صاحب، آپ۔ آپ کب آئیں۔!" اس نے ٹوٹے

چھوٹے دانت نکال دیے۔ "اور۔ وہ دولہا میاں کہاں ہیں۔ آپ کا سامان، مطلب یہ ہے کہ۔"

"چپ رہ بڈھی تجھے ان سب باتوں سے کیا مطلب۔ سن! میرا کمرہ بند ہے کہ اس میں بھی تیرے عاشق مزاج سرکار نے اپنے کسی سالے سالی کو آباد کر رکھا ہے۔ دیکھ کر آ۔ دیر مت لگانا۔!"

"آپ کا کمرہ بند ہے۔" افسری نے خاصی درشتی سے جواب دیا۔ "اس میں کوئی سالا سالی آباد نہیں ہے۔ اور بی بی سن لو کہ پھر کبھی اس طرح زبان چھوڑ کر مجھ سے بات نہ کرنا۔ اب میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں میں سرکار اور مالکن کا نمک کھا رہی ہوں۔ تمھارا نہیں۔ پھر کبھی تم یوں بولو گی تو ویسا ہی جواب بھی سن لو گی۔!"

فاخرہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس وقت کچن میں سارے ملازم اکٹھا تھے۔ اگر وہ بڑھیا برہا تھ چھوڑ دیتی تو تعجب نہ تھا کہ جواب میں اپنی بے عزتی سے محفوظ نہ رہتی ممکن تھا کہ سب ہی بدتمیزی پر اتر آتے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ۔ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا:

"نئی مالکن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں یہ ہوا نکال دوں گی۔ تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ میں اگر چھ سات مہینے گھر سے باہر رہی تو تم لوگوں نے مجھے کوئی غیر آدمی سمجھ لیا ہے۔"

"ایک وہ نئی بی بی ہیں۔" بڈھی افسری بڑبڑائی تھی۔ "قربان جاؤں جب سے آئی ہیں۔ خالہ خالہ کہہ کے منہ سکھا رہی ہیں۔ زبان سے جیسے شہد ٹپک رہا ہے۔ کہو بھلا میں کہاں اور وہ کہاں۔ مگر آفریں ہے۔ کوئی دس بار مجھ سے ناشتہ کھانے کو پوچھ چکی ہیں۔ اللہ ان کی ہزاری عمر

کرے۔ دنیا جہان کے سکھ دیکھنے نصیب کرے۔ میرے تو رُواں رُواں سے ان کے حق میں دعا نکلتی ہے۔!"

فاخرہ کی بچی پھر چلانے لگی تھی۔ وہ اسے سنبھالے کچن سے باہر نکلی۔ اس کی پیٹھ پھری ہی تھی کہ سب ملازم ایک ساتھ ہنس پڑے۔ خانساماں بولا "دانت کھٹے کر دیئے تم نے بھی خالہ۔ ارے یکبارگی تمھیں کیسے غصہ آگیا تم تو بڑے ٹھنڈے مزاج کی ہو۔ مگر خدا کی قسم میں تو خوش ہو گیا۔ صاحبزادی نے کبھی بھولے سے بھی تو زمین پر رہ کر بات نہیں کی۔ جانے کن ہواؤں میں رہتی ہیں۔!"

"ارے اب نکل جائے گی ساری ہوا۔" افسری جل کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "سرکار ایک منٹ کو انہیں برداشت نہ کریں گے۔ وہ پہلے ہی غصہ میں بھرے تھے۔ کہہ ہی چکے ہیں کہ میرے حق میں وہ مر چکی۔ نجانے آئی کیسے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں نے بیوی کے روپے پر گل چھرے اڑا کر اب گھر سے نکال باہر کیا ہے۔ مگر اب دوبارہ مٹھی گرم نہ ہو گی۔ سرکار کانی کوڑی تو دینے والے نہیں ہیں۔! میں سب سمجھتی ہوں۔!"

فاخرہ نے یہ بھی سنا۔ اور دانت پیستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ملازموں کی تو وہ دشمن تھی ہی۔ عافیہ سے بھی نپٹنے کے بیتیرے سوچ رہی تھی۔!!!۔

ظہیر صاحب کو اپنے دوست کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔ ان کا تو

گویا یکبارگی تختہ ہی الٹ کر رہ گیا تھا! ہفتہ بھر بعد وہ پھر بیت الکریم گئے پتہ چلا کہ ان کی لڑکی کا نکاح کسی سے ہو گیا اور بیوی اور لڑکا اپنے وطن چلے گئے۔ بیت الکریم پر تالا پڑا تھا۔ نئے ہمسائے کچھ زیادہ معلومات ظہیر صاحب کو نہیں پہونچا سکے۔! وہ دل گرفتہ سے گھر آئے اور بیوی سے ساری روداد کہی۔ بیوی پہلے ہی نہایت غمگین تھیں۔ انھیں عافیہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر بڑا صدمہ تھا۔! وہ اسے بہت چاہتی تھیں انھوں نے یہ تمام باتیں جو کریمی صاحب کے خاندان کے ساتھ پیش آئی تھیں۔ اپنے خط میں بڑی تفصیل کے ساتھ دانش کو لکھ دیں۔ اُدھر دانش کا یہ حال تھا کہ وہ عافیہ کی مسلسل خاموشی سے سخت پریشان تھے۔ پہلے پہل عافیہ کے ہمت افزا محبت بھرے خط انہیں ہر دس بارہ دن میں ایک مرتبہ ضرور ملتے تھے۔ اور پھر دفعتہً اس کے خط آنے بند ہو گئے۔ چھ ماہ گزر چکے تھے۔! دانش کے اوقات نہایت اضطراب اور بے چینی میں بسر ہو رہے تھے۔! طرح طرح کے خیالوں نے ان کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی۔! پہلا اندیشہ تو انہیں یہی ستاتا تھا کہ شاید کریمی صاحب ختم ہو چکے تھے اور عافیہ نے اپنی پریشانی میں انہیں خط نہیں لکھا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال خام تھا۔ کیوں کہ خود عافیہ ہی نے لکھا تھا کہ کریمی صاحب بالکل صحت مند اور تندرست ہو چکے ہیں۔! پھر کیا وجہ تھی عافیہ کی خاموشی کی۔! ان کا جی اچاٹ رہنے لگا۔! نہ تعلیم سے دلچسپی رہی نہ اس آرزو میں کوئی جان رہ گئی کہ وہ ماہر امراض قلب کہلائے جائیں! انھیں عافیہ سے بے لوث محبت تھی۔ اور وہ اپنی محبت پر اپنی تمام تمناؤں کو قربان کر سکتے تھے۔!

ان کے بار بار استفسار پر ان کی والدہ نے سوچے سمجھے بغیر کریمی صاحب کے خاندان کی تباہی کی مکمل کہانی دانش کو بڑی تفصیل سے لکھ بھیجی۔ ساتھ ہی اپنی طرف سے نصیحت اور تلقین بھی کر دی کہ وہ اس طرف سے دھیان ہٹائیں اور اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔

اس کے بعد پھر دانش کا کوئی خط نہیں آیا۔ اور اپنے خط کا کوئی تذکرہ انہوں نے ظہیر صاحب سے بھی نہیں کیا۔! لیکن ان کی حیرت اور تعجب کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب ایک دن بے سان وگمان دانش ان کے سامنے آکھڑے ہوئے۔!

وہ بوکھلا گئیں۔ دانش کو ٹک ٹک تکتی رہ گئیں۔ منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ان کو سمجھنے میں کیا دیر لگتی کہ یہ گُل ان ہی کا کھلایا ہوا ہے۔! دانش بالکل دیوانے لگ رہے تھے۔! لباس ملگجا۔ داڑھی بڑھی ہوئی منھ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں! ماں بیٹے میں رسمی سی علیک سلیک بھی نہ ہو سکی۔! دانش نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جو کچھ آپ نے لکھا تھا۔ کیا وہ سب سچ ہے امی۔ یا آپ نے مجھے واپس بلانے کا بہانہ بنایا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کئی راتوں سے میں سویا نہیں ہوں۔ عجیب عجیب سے بھیانک خیالات مجھے ستا رہے ہیں۔ امی کیا چچا صاحب۔ میرا مطلب ہے کیا وہ سچ مچ ختم ہو گئے۔"

انہوں نے ایک سسکی لی اور سر جھکا لیا۔!

ظہیر صاحب کی بیوی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔! "بیٹے۔ ایسا جھوٹ تم سے کون بولتا۔ مگر کیا تم اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کے چلے آئے ہو؟ کیا بات ہوئی ہے۔ مجھے تو تم اللہ نہ کرے بیمار لگتے ہو۔!"

میں نے آپ سے کہا نا امی کہ میں بہت پریشان ہوں۔" دانش نے کہا۔ اب ان کے چاروں بھائی ان کے پاس آ بیٹھے تھے اور حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں اپنی امی اور بھائی کی باتیں سن رہے تھے۔! دانش کی بات کے جواب میں تابش نے کہا۔ " آپ کی پریشانی بجا ہے بھیا۔ ہمیں خود بھی نہایت افسوس ہوا تھا۔! آپ کو امی نے سچ ہی تو لکھا تھا۔ چچا صاحب کے مرنے میں ہم سب لوگ گئے تھے چچی بی کہہ رہی تھیں کہ وہ سوتے کے سوتے رہ گئے! انہیں بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ کیونکہ وہ عافیہ کی گمشدگی ۔۔۔۔! " وہ چپ ہو گیا۔!

" گمشدگی ۔! " دانش نے اپنی دھکتی ہوئی کنپٹیاں جکڑ لیں۔ " اُف میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا ہوا۔ چچا صاحب نے کس کا کیا بگاڑا تھا کس نے ان سے دشمنی نکالی۔ تابش سچ سچ بتاؤ۔ اب عافیہ کہاں ہے؟"

" کیا امی نے آپ کو نہیں لکھا؟ " تابش نے پوچھا۔

" مگر مجھے یقین نہیں آتا۔! " دانش بولے۔ تابش خاموش رہا۔ امی ایک آہ بھر کر بولیں۔

" ارے ان پر بڑی بپتا پڑی۔ میں تو گئی ہی تھی۔ کیسی کیسی پچھاڑیں کھا رہی تھیں بہن خیر النساء۔ اور ناصر بھائی کی حالت یہ تھی کہ جیسے سانس اب رکی کہ تب رکی۔ ان بے چارے آفت کے ماروں کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ نجانے کون موت کھایا تھا جس نے معصوم عافیہ کے ساتھ ۔۔۔۔! "

" بس امی ۔! " دانش نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ان کا چہرہ متغیّر ہو گیا تھا۔ " میں یہ نہیں سن سکتا کہ عافیہ کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ

ماننے کی بات ہی نہیں ہے۔ اصل واقعہ کچھ اور ہو گا۔ !"

"بھیا۔ آپ چچا صاحب کے ہمسایوں سے پوری بات کیوں نہ دریافت کر لیجئے۔ !" تابش نے رائے دی۔ !ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں ہوا۔ بس ایک رات کو حمزہ بھائی یہ پوچھنے آئے تھے کہ عافیہ ہمارے یہاں تو نہیں آئیں اور بس دوسرے ہی روز یہ معلوم ہوا کہ چچا صاحب نے ان کا نکاح کر دیا ہے۔

"کس سے کر دیا ہے۔ ؟" دانش نے قہر ناک انداز میں کہا اور اپنی ماں کی طرف مڑے۔ وہ چپ رہیں۔ دانش کو غصہ آ گیا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ آپ اس سے متنفّر ہو گئی تھیں۔ اس منحوس واقعہ کے بعد آپ نے اس کی بابت کچھ پوچھنا مناسب ہی نہیں سمجھا اسے اس کی تقدیر کے حوالے کر کے آپ چلی آئی تھیں۔ امی اگر آپ کو بھی خدا نے کوئی بیٹی دی ہوتی تو آپ بیٹی کی ماں کا درد اپنے دل میں بھی محسوس کرتیں۔ آپ عافیہ کے حق میں اتنی سنگدل بن گئیں امی۔ حالانکہ آپ نے اسے اپنی بیٹی کہا تھا! یہ سارا قصور آپ کا ہے۔ !"

"میرا۔" وہ بھونچکا ہو کر بولیں۔

"ہاں۔ آپ کا۔" دانش اپنی ادب تمیز بالائے طاق رکھ چیخے "میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ رسم و رسم کا ڈھونگ مت کیجئے۔ نکاح ہی کی درخواست لے کے جائیے۔ آپ نے میری نہ سنی۔ دراصل آپ مسلسل تین سال تک اسے اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ اگر آپ نے میرا نکاح اس سے کر دیا ہوتا تو وہ آج آپ کے پاس آپ کی پناہ میں ہوتی یہ نجس واقعہ پیش نہ آتا۔ مگر آپ کو اس کی بہتری منظور نہ تھی آپ کو میرا مستقبل پیارا تھا کہ میں کہیں اپنی تعلیم سے غافل نہ ہو جاؤں۔

اس کی محبت میں کھو نہ جاؤں۔ تو امی اب سن لیجئے کہ تعلیم والیم پر میں نے لعنت بھیج دی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں عافیہ کو تلاش کروں گا۔"

سہمی ہوئی آواز میں امی نے کہا۔ "اب تلاش کر کے کیا کرو گے بیٹا۔ وہ تو دوسرے کی ہو چکی۔ تم نے اسے تلاش کر بھی لیا تو کیا۔؟"

دانش پاگلوں کی طرح بڑبڑانے لگے۔ "کس سے پوچھوں۔ کیا کروں۔ اس طرح تو ایک بری بات تمام میں پھیل جائے گی۔ اوہ خدا ۔۔۔!"

ان کی امی خوفزدہ نظروں سے دانش کو دیکھنے لگیں۔ کہیں ان کا دماغ تو ماؤف نہیں ہو گیا تھا۔ اب عافیہ کی تلاش کس کام کی ۔ مگر وہ چپ رہیں جانتی تھیں کہ دانش جس قدر خوش مزاج ہیں اسی قدر غصہ ور بھی۔ جب انہیں غصہ آجاتا تھا تب وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ اور جذباتی اور حسّاس تو شروع سے تھے۔!

"چچی صاحبہ اور حمزہ کہاں چلے گئے۔؟" دانش نے سوچتے سوچتے سر اٹھا کر پوچھا۔

ابھی وہ بالکل خاموش سی سر جھکائے ڈلی کاٹتی رہیں تو تابش نے جواب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور سہمے ہوئے لہجے میں کہا:

"چچا صاحب کے انتقال کے چوتھے روز جب ابا جان بیت الکریم گئے تو پتہ چلا کہ ۔۔۔!"

"پتہ چلا کہ بیت الکریم کم بخت پر قفل پڑا ہے۔ یہی نا۔؟"

"جی ہاں۔!"

"ارے ابا جی تو چچا صاحب کے پرانے دوست تھے۔ دکھ سکھ میں شریک۔ اچھے برے کے ساتھی۔ پھر یہ کیا ہوا کہ پرانے دوست کو

کریمی صاحب کی رحلت کی خبر دی تھی۔ اور تو کچھ لکھا نہیں تھا۔ ایہ کیا قصّہ ہے؟" انہوں نے ٹھیک پولیس والوں کی نظر سے بیوی کو گھورا وہ گڑبڑا کر بولیں:

"میں نے سوچا کہ تین سال تک اسے دھوکے میں کیسے رکھا جائے گا اس لیے میں نے ـــ!"

"تم نے اپنی عادت کے مطابق خوب نمک مرچ اور کلی پھندنے لگا کے واقعات کو تفصیل سے تفصیل ترین کر کے اسے لکھ دیا تھا۔ یہ قصہ ہوا ہے۔ تو پھر اب تم ہی بھگتو! اپنی غلطی تم نے تب بھی قبول نہ کی تھی۔ ! میں نے مشورہ دیا تھا کہ لڑکی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے چلو۔ تم نے میرا مشورہ ٹھکرا دیا تھا۔ کہ دانش نجانے کیا کہے گا۔ اور اب جو کچھ دانش کہے گا۔ وہ بھی صرف تم ہی سنو گی۔ جواب دہی بھی تم ہی کو کرنی ہے۔" ظہیر صاحب نے صاف طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی نے بدحواس ہو کر کہا:

"یہ کیسی آپ سب کی بے انصافی ہے۔ میں نے کیا کیا ہے۔ آج سب مجھ ہی کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں۔ وہ بھی اپنا غصہ مجھ پر اتار رہے ہیں آپ اس طرح الگ ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے وہ سارا کیا دھرا میرا ہی ہو۔"

"بے شک کچھ کیا دھرا تمہارا بھی ہے۔" ظہیر صاحب نے کہا۔ "تم عورت ہو۔ تمہیں عافیہ کا دکھ سمجھنا چاہئے تھا۔ تمہیں اس کی مصیبت زدہ ماں اور غم نصیب باپ کے دل پر رکھے ہوئے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہئے تھا۔ مگر تم نے روشن خیالی، عالی ظرفی اور بلند نظری کا ثبوت نہیں دیا یاد کرو کہ تم نے مجھ سے کہا تھا۔ اب وہ لڑکی ہمارے لڑکے کے قابل نہیں رہی ـــ قسم خدا کی۔ مجھے تمہارا جواب بہت گراں گزرا تھا۔ مگر میں

ہوا تو بہت بری طرح پیش آؤں گا۔!"

"کب تک فاقے کریں گے۔" بیوی نے گلوگرفتہ لہجے میں کہا۔

"جب تک جی چاہے کریں۔ مر نہیں جائیں گے۔!" ظہیر صاحب برافروختہ ہو گئے۔!

"جو کچھ اباجی کہتے ہیں آپ وہی کیجئے امی۔" تابش نے کہا۔

دانش ایک پہلو پر دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کے ذہن میں خیالوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ آخر کیا سوچ رہے تھے۔ اب ان تمام سوچوں سے ہونا بھی کیا تھا۔؟ رہ رہ کر ان کا دل بھر آتا۔ کیا ہونا تھا اور کیا ہو گیا۔ بار بار دل میں ایک ٹیس اٹھتی۔ کیا سچ مچ عافیہ کے ساتھ کوئی شرمناک زیادتی کی گئی۔

انھیں اس کی تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ کتنی حیا پسند، شرمیلی، چھوئی موئی سی تھی۔ گوارہ نہ کرتی تھی کہ وہی اس کو چھو لیں۔ پاس آنے پر کس طرح سہم جاتی تھی۔ محبت آمیز باتوں پر اُس کا معصوم چہرہ گلابی ہو جاتا جواب دینے میں صاف کترا جاتی۔ اس کی بے لوث محبت صرف آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ دلفریب تبسّم سے عیاں ہوتی تھی۔!

اس کی محبت سچی تھی۔ اس کے مدھم مدھم سے محبت کے اعتراف سچے تھے اس کی تمام قسمیں سچی تھیں۔ وہ اپنے عہد و پیمان نبھا سکتی تھی۔ اگر عمر بھر دانش اس سے دور رہتے تب بھی وہ ساری زندگی ان کا انتظار کرتی اور ہرگز عہد شکنی نہ کرتی۔ اس کی سرشت میں بے وفائی نہ تھی۔!

اور نجانے وہ کیسے مجبور کر دی گئی۔

جب اسے کسی بد نہاد بدمعاش نے پکڑ لیا ہو گا۔ تب کیا حال ہوا ہو گا اس

کار رہی ہو گی۔ تڑپی ہو گی۔ شاید مدد کے لیے انھیں پکارا ہو۔ جو اس سے ہزاروں میل دُور تھے۔ ہائے۔ دل کی آواز تک تو ان کے دل میں گونجی نہیں۔ نجانے اس پر کیا گزری ہو گی۔ آہ۔ اس نے اپنی بے آبروئی کیسے قبول کی ہو گی کیا اس کا دماغ الٹ نہ گیا ہو گا۔ ایسی شدید کوئی مصیبت ہو گی جس نے اس مختصر سے کنبے کا نام نشان تک مٹا دیا۔ نجانے کون سا صدمہ تھا جس نے چچا صاحب کی جان لے لی۔ کیسے ہنس مکھ، خوش مزاج، نیک اور مخلص آدمی تھے ناکام و ناشاد چلے گئے۔! اپنی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اور بے چاری چچی بی۔ جنھوں نے ایک عرصے سے کسی موہوم سی خوشی کا منھ نہیں دیکھا تھا۔! وہ اب کس حال میں ہیں؟۔ کہاں ہیں؟۔

کس سے پوچھوں؟ کہاں جاؤں۔ کیا کروں؟

بے خبری میں ان کے گرم گرم آنسو گالوں پر بہہ نکلے!

"مجھے میری عافیہ مل جائے۔" وہ سسکنے لگے۔ "میں اسے ہر حال میں قبول کر لوں گا۔ اس سے نہیں پوچھوں گا کہ تم پر کیا گزری۔ اس کے زخم نہیں چھیلوں گا۔ میں تو اس کے زخموں کا اندمال بننا چاہتا ہوں۔ اسے میں اپنے سینے میں چھپا لوں گا۔ اس کے آنسو پونچھوں گا۔ اس کے بے پناہ غموں کو بے پایاں خوشیوں میں بدل دوں گا۔ اسے اپنا لوں گا۔ ہر حال میں اپناؤں گا۔ مگر وہ ہے کہاں۔ کس کے پاس ہے؟ اسی شہر میں ہے کہ کہیں دور جا چکی ہے۔ وہ اپنی حالت پر مطمئن ہے کہ چھپ چھپ کر آنسو بہاتی ہے وہ آدمی جس نے اسے پناہ دی ہے۔ وہ اپنے طعنوں سے اس کا جگر چھلنی تو نہیں کرتا۔ اسے اس کی برباد حیثیت یاد تو نہیں دلاتا۔؟

"اے خدا! ان روحی اذیتوں کا کوئی مداوا تیرے پاس ہے کہ نہیں؟"

ان کی سسکیاں اب بے اختیار گریہ وزاری میں تبدیل ہو گئیں۔ ایوں آواز سے رو رہے تھے جیسے وہ تنہا ہوں۔ اور وہ اپنے وحشت ناک خیالوں کے تپتے ہوئے صحرا میں تنہا ہی تھے۔!

ظہیر صاحب اور ان کی بیوی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ دانش اپنی محبت میں اتنے بڑھ چکے تھے کہ اب پیچھے لوٹنے کا سوال ہی نہ رہ گیا تھا۔ انھیں بس یہ خیال تھا کہ نیا نیا صدمہ ہے اور شدید ہے۔ رفتہ رفتہ اثر زائل ہوتا جائے گا۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر نارمل ہو جائیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ جوں جوں دن گزرتے گئے۔ دانش کا پاگل پن شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔!

انہیں دنیا اور دنیا کی مصروفیات سے کوئی سروکار نہ رہا۔ نہ تو کسی سے بات چیت کرنے کا دل چاہتا نہ کسی کی شکل اچھی لگتی۔ والدین اور بھائی بھی ان کے لیے اجنبی ہو گئے۔ گھر کی حیثیت سرائے کی سی تھی! سرائے۔ جس میں مقیم مسافروں اور بنجاروں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایکدوسرے سے جان پہچان پیدا کریں۔!

ان کے اس رویّے نے ظہیر صاحب کو بھی پریشان کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو کوئی جان لیوا بیماری دانش سے دور نہیں ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد پتہ چلایا کہ ڈاکٹر سجاد ہی دانش کے واحد دوست تھے۔ جو فی الحال دانش کا کلینک سنبھالے ہوئے تھے ظہیر صاحب نے سجاد سے مل کر دانش کی آمد کی اطلاع دی تو وہ حیران رہ گئے۔ ظہیر صاحب نے بڑی لجاجت سے ان سے استدعا کی کہ وہ دانش کے دوست ہیں۔ وہی انہیں سمجھائیں۔ دوبارہ دنیا میں واپس لائیں انہیں ظہیر صاحب نے تاکید کر دی تھی کہ ان سے ملنے کا تذکرہ دانش

"ارے میاں۔ مذاق میں مت ٹالو۔" سجاد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ "چلو میرے ساتھ۔ آج ہی مکمل معائنہ کروائے لیتے ہیں۔ مرض کو پالنا چاہتے ہو کیا۔؟"

"تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام۔ جاؤ بھائی۔ اپنا کام کرو۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان مت کرو۔ میں کہیں جاؤں گا نہیں۔! اپنا خلوص مجھ پر ضائع مت کرو۔!" دانش کی باتیں، ان کا سلوک سجاد کی سمجھ سے باہر تھا۔! وہ بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ سمجھاتے رہے۔ مگر دانش پر عجیب سی "مجذوبیت" طاری تھی۔ اپنی کہتے نہ تھے دوسرے کی سنتے نہ تھے۔! تھک ہار کر بالآخر سجاد بھی چپ ہو گئے۔!

ظہیر صاحب کے استفسار پر سجاد کو صرف یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ دانش کی منگنی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی شادی کسی اور جگہ ہو گئی۔ لڑکی والوں کے لیے تین سال کا انتظار صبر آزما تھا۔ بس دانش کو اسی بات کا صدمہ ہے۔! غصہ ہے۔

"آپ انہیں آمادہ کیجئے کہ وہ کہیں اور شادی کر لیں۔" سجاد نے کہا۔

"یہ صورت حال تو بہت تشویشناک ہے۔ کیا عمدہ مستقبل تھا دانش کا۔ خواہ مخواہ خود کو تباہ کر رہے ہیں۔"

"اس قسم کا کوئی مشورہ قبول نہیں کریں گے۔ ہم ان کی فطرت سے واقف ہیں" اور واقعی دانش نے ایسی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ سجاد نے شادی کی رائے دی۔ دانش نے استہزائیہ انداز میں کہا:

"تم کچھ جانتے بوجھتے نہیں۔ دوسروں کے بہکانے پر میرا دماغ کھانے چلے آتے ہو۔ مجھے ہرگز شادی وادی نہیں کرنی ہے۔ اگر پھر کبھی مجھ پر تم

نے یا کسی اور نے زور دیا تو گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔! تم اپنے کام سے کام رکھو مجھے پریشان مت کرو۔! سمجھے !۔"

انہیں سب نے ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخر کبھی تو سنبھلیں گے!!!

فاخرہ اپنے باپ کے گھر کیا آگئی گویا بھونچال آیا تھا۔! وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کبھی اپنی خطا مان کر شرمسار نہیں ہوتے بلکہ الٹا ناراض ہو جاتے ہیں۔ دھاندلی پر اتر آتے ہیں۔ اور زیادہ بے غیرتی کرنے لگتے ہیں اس نے بیرسٹر صاحب کی سوء مزاجی اور بدمزگی کی قطعی کوئی پرواہ کئے بغیر اپنی بپتا سنائی تھی !۔

راحیل حد درجہ کمینہ اور بد معاش ثابت ہوا تھا۔ اس نے دھوکے سے فاخرہ کی جائیداد کا وہ چیک رکھ لیا جو اسے ملا تھا اور بد قسمتی سے فاخرہ نے اس پر اپنے دستخط کر دیئے تھے۔ اس کا ارادہ رقم حاصل کرنے کا تھا پھر اس نے ارادہ بدل کر سوچا کہ جب تک راحیل کو بیوقوف بنا کر اس سے خرچ کروائے تبھی تک ٹھیک ہے۔! لیکن راحیل نے اسی کو بیوقوف بنا دیا۔ اس نے جانے کب اس کا چیک کیش کروالیا یا کھو دیا یا پتہ نہیں کیا کیا بہرحال ایک حبہ بھی فاخرہ کو نہیں مل سکا۔ چند ماہ راحیل نے بے شک اسے عیش کرادیا۔ وہ شملہ، پھر مدراس اور بمبئی کی تفریحیں کرتے پھرے۔ جب فاخرہ کا ناپسندیدہ بوجھ دوگنا ہو گیا اور وہ راحیل کا ساتھ دینے سے مجبور

ہوگئی تو پھر اس نے نئے نئے جھگڑے نکالے۔ لڑنے لگا۔ اسے طعنے دیئے اور ضد یہ کردی کہ فاخرہ کے ہونے والے بچے کو اپنا بچہ ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ تک کہہ دیا کہ وہ سیکڑوں مردوں سے فلرٹ کرتی پھرتی تھی۔ اس کا چال چلن شروع ہی سے مخدوش تھا۔ لہذا راحیل کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ اسی کا بچہ ہے۔ اور وہ فاخرہ کو ساتھ نہیں رکھے گا۔ فاخرہ اپنی ہار ماننے والی کب تھی۔ وہ بھی مقابلہ پر آگئی۔ اور تب راحیل نے کمینہ پن کی انتہا کر دی اگر فاخرہ کی زبان چلی تو راحیل کا ہاتھ چلا۔ اکم بخت نے اچھی طرح پیٹ کر رکھ دیا۔ اس مرحلہ پر فاخرہ بڑے درد سے روئی۔ اور اس منحوس چوٹے پر دل کھول کر لعنت بھیج کے چلی آئی۔!

نہایت صبر وسکون سے بیرسٹر صاحب نے اس کی داستان سنی۔ اور پھر بڑے سرد لہجے میں بولے۔ "یہ سب کچھ تم جا کے راحیل کے باپ سے کہو آخر وہ تمھارے سسر ہیں۔ شاید تمھیں اپنے گھر میں پناہ دے دیں۔ اور شاید اپنے صاحبزادے کی سرزنش کریں۔ میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتا میں نے تمھیں راحیل سے شادی کرنے کو منع کیا تھا۔ یاد ہے تم کو۔ تم نے کتنی بدتمیزی سے میرے ہر استدلال کو میرے منھ پر پھینک مارا تھا!۔ تب تو بہت بڑھ بڑھ کے بول رہی تھیں۔ اب تمھارے یہ مگرمچھ کے آنسو میرے لیے محض بے کار ہیں۔ مجھ پر ان کا اثر نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں۔ تم میرے گھر سے جاؤ۔ اور اس بدقماش آدمی کی اولاد کو بھی لیتی جاؤ۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔!"

فاخرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کو کسی نے خوب اچھی طرح میرے خلاف بہکا دیا ہے۔"

کانپ رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:
"آپ ان کا مطالبہ مان کیوں نہیں لیتے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میں نے آپ کو سکھا دیا ہے۔ آپ خدا کے واسطے ان کی مدد کر دیجئے۔ وہ تو سب کچھ لٹا چکی ہیں۔ آخر آپ کے ہوتے کہاں جائیں گی۔ آپ انہیں گھر سے نہ نکالئے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی بری راہ پر چل پڑیں۔!"
"جائے جہنم میں۔" انہوں نے بڑے استکراہ سے جواب دیا۔ "سنا نہیں تم نے۔ اپنے منہ سے بے شرمی کی داستان اس نے کتنی تفصیل سے سنائی تھی۔! نہیں۔! مجھے مجبور مت کرو۔ اب تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ تم سے کس طرح انتقام لیتی ہے۔ اس نے جیتے جی مجھے مرحوم سمجھ لیا ہے نا تو یہی سہی۔!"
عافیہ چپ ہوگئی۔ اس گھر میں اس کے شب و روز عجیب سے گزر رہے تھے! اور وہ خود حیران تھی! بیرسٹر صاحب نے اسے پناہ دی تھی۔ اور جائز طور پر اس کے مالک بن چکے تھے!۔ لیکن۔ ابھی تک انہوں نے اسے کسی ناپسندیدہ خواہش کی تکمیل پر مجبور نہیں کیا تھا!۔ نہ کبھی پھر ان کی زبان سے اس نے کوئی جذباتی فقرہ ہی سنا تھا۔ گویا ان کا نکاح صرف پناہ برائے پناہ تھا۔ اور انہیں اپنی عمر و مرتبہ کا اس قدر شدید طور پر احساس تھا کہ وہ ہر طرح عافیہ سے گریزاں تھے۔! انہوں نے اس کے آرام و آسائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ساری کوٹھی اور اس کا پورا اثاث البیت عافیہ کے چارج میں تھا۔ جو چاہتی رکھتی اٹھاتی۔ بیرسٹر صاحب کو کوئی سروکار نہ تھا۔ انہوں نے اسے اپنی تمام کنجیاں دے دی تھیں۔ اور ہر چیز سے دست کش ہو گئے تھے۔ نجانے کیوں ان کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔! اب وہ نہ تو عدالت جاتے تھے اور نہ ہی گھر پر کسی موکل کی موجودگی پسند کرتے تھے۔ کتنے ضرورت مند اس عرصہ میں آئے

اور چلے گئے۔ بیرسٹر صاحب نے ان کی مشکلات سننا اور حل کرنا تو ایک طرف، ان سے ملنا تک پسند نہ کیا۔! گویا قطعی گوشہ نشین ہو گئے تھے۔!

اب وہ کسی کے زیر علاج بھی نہ تھے۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے کوئی اندرونی بیماری گھن کی طرح انہیں اندر اندر ہی کھائے جا رہی ہو۔ عافیہ کے کچھ پوچھنے پر وہ اسے اسی طرح بہلا دیتے جیسے اسے محض بچہ سمجھتے ہوں عافیہ ان کا یہ حیران کن رویّہ سمجھنے سے قاصر تھی۔!

عافیہ کو مارے باندھے ان ہی کی خواب گاہ میں رات بسر کرنی پڑتی۔! اور وہ تقریباً ساری رات سوتے جاگتے گزار دیتی۔ ہر لحظہ کسی ناگوار اندیشے کے سامنے آنے کا ڈر لگا رہتا۔ لیکن نہیں۔ بیرسٹر صاحب اس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے! شب خوابی کا لباس پہن کر آتے۔ معمول کے مطابق روشنی گل کرتے اور دیوار کی طرف مڑ کر سو جاتے۔! گویا کہ عافیہ کے وجود ہی کو یکسر فراموش کر جاتے۔!

شروع شروع میں وہ وحشت زدہ سی اپنی مسہری پر رات بھر بیٹھی رہتی اور مدھم سے اجالے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی کہ اب انہوں نے اس کی طرف کروٹ لی کہ اب لی۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایک ہی پہلو پر لیٹے لیٹے بیرسٹر صاحب نے سویرا کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ خوف اس کے دل سے نکلا تھا۔ اب وہ بھی سونے کی کوشش کرتی تھی۔ اکثر سو بھی جاتی تھی۔! کئی دفعہ اس نے خواب سا دیکھا۔ کہ کوئی اس پر جھکا اس کے چہرے کو تک رہا ہے! اس کی سانسیں اس نے اپنے رخساروں اور پیشانی پر محسوس کی ہیں۔ دو گرم ہاتھوں نے اس کا چہرہ تھام رکھا ہے!۔ اور وہ جب ایسے خواب سے بیدار ہوتی تو فوراً دوسری مسہری کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتیں۔

شرمندگی اور ندامت اسے پسینہ پسینہ کردیتی۔ وہ تو بدستور بے خبر سورہے ہیں۔ پھر اس نے ابھی ابھی جو سب کچھ محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ خواب نہ ہو۔ حقیقت ہو تو کیا وہ سب کچھ اس کے ناآسودہ جذبات کا کوئی جذباتی ردِ عمل تھا!۔ کیا تھا وہ سب کچھ۔ کیا تھا؟ — اور وہ گم صم سی بیٹھی بیرسٹر صاحب کی بھاری سانسوں کی گونج سنا کرتی۔ حتیٰ کہ صبح کی روشنی پھیلنے لگتی۔!— جب کئی دفعہ اس نے ایسے خواب دیکھے تو پریشان رہنے لگی۔ آخر وہ کیا چاہتی ہے۔؟

اپنے شوہر کی محبت، اپنا حق، ان کی توجہ — اور وہ پرمسرت زندگی جو ہر شادی شدہ عورت کا نصیب ہے۔؟

کیا وہ سچ مچ بیرسٹر صاحب کو چاہنے لگی تھی۔ اس کی چاہت ان جذبوں سے بھی ملوث تھی جن سے وہ ابھی تک ناآسودہ کام رہی تھی۔ کیا وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ عافیہ ان کی بیوی تھی۔!؟

اس کی حالت پاگلوں کی سی رہنے لگی۔ دوہری شخصیت تھی اس کی۔ دن بھر وہ یہ سوچ سوچ کر خدا کا شکر ادا کرتی کہ رات آرام و سکون سے گزر گئی۔ اور جب رات آتی تب خواہ مخواہ عجیب عجیب سے خیال اس پر یلغار کر دیتے اور پھر کچھ اضطراب کچھ بے چینی سی اسے باقی رات سونے نہ دیتی! کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی اور کبھی باغ کی طرف کی کھڑکی کھول کر اندھیرے اجالے کے امتزاج میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگتی۔ ایک رات اسے باؤلوں کی طرح کمرے میں پھرتے دیکھ کر بیرسٹر صاحب نے پوچھ لیا۔ "عافیہ کیا بات ہے۔ نیند نہیں آتی تمہیں؟"

نجانے وہ کب سے جاگ رہے تھے اور اس کی نقل و حرکت دیکھ رہے

"آپ نے امی کے پاس جانے کی اجازت دی تھی۔! ان سے ملنے کا دل چاہتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسی ہیں۔ اتنے دنوں سے کوئی خط نہیں آیا۔ میں تھوڑے دنوں کے لیے جاؤں گی۔!"

"ضرور ضرور۔۔ اس میں مجھ سے اجازت کا کیا سوال ہے۔" انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔ "جب جی چاہے چلی جاؤ۔ جتنے دن جی چاہے۔ ان کے پاس رہ آؤ۔ میں صبح ہی کو ڈرائیور سے کہہ دوں گا۔ وہ بائی کار پہونچا دے گا۔"

سخت نفرت سے انہیں گھورتی ہوئی وہ بولی۔ "تو آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ میں چلی جاؤں۔"

"میرا دل بس یہی چاہتا ہے کہ تمھاری چھوٹی سے چھوٹی تمنا ہو وہ بھی پوری کرے۔!"

"مجھے معلوم ہے کہ میں زبردستی آپ کی اچھی بھلی زندگی میں چلی آئی ہوں۔ ورنہ کہاں آپ اور کہاں میں۔۔ آپ نے مجھے پناہ دی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ۔۔۔۔! " نجانے کیا الٹی سیدھی بکواس کر کے وہ خود ہی رو پڑی۔!

کتنے سنگدل ہیں۔ اس نے تو یونہی بہانہ بنایا تھا۔ شاید وہ اس کا سر دباتے۔ وہ باتیں کرتے جو وہ سننا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی تمناؤں کے شیش محل پر بیرسٹر صاحب نے اپنے سرد سلوک کے پتھر برسا دیئے۔! وہ تو اس کے آنسو پونچھنے بھی نہیں اٹھے۔ دیکھتے رہے اور الجھی الجھی سانسیں لیتے رہے۔!

اگر ان کی جگہ دانش ہوتا۔ اچانک ذہن کے کسی بند دریچے پر دانش

کی یاد نے دستک دی اور اس ایک یاد نے دل میں طوفانی جذبوں کا محشر بپا کر دیا۔ اور گھبرا کر وہ بول پڑی۔

"میں سمجھ گئی۔ آپ نے مجھ سے کس لیے شادی کی۔ میں آپ کی نظروں میں بے عصمت تھی۔ میرا باپ مجھے کنویں کھائی میں جھونک رہا تھا۔ مجھے کون پناہ دیتا۔ میرا کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ آپ نے احسان کیا مجھ پر۔ تو۔ پھر ایک احسان اور کیجئے۔ مجھے زہر دے دیجئے۔ اب میں آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ جینا نہیں چاہتی۔"

اور اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان سنا وہ کہہ رہے تھے: "سچ سچ میں نے تم پر ظلم کیا۔ تمہیں قید کر کے رکھ دیا ہے۔ اپنے گھر میں۔ تمہارے محسوسات کا پاس و لحاظ نہیں کرتا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں کیا کروں تمہارے لیے۔ عافیہ۔ کیا کروں تمہارے لیے۔ اور یہ جو تم کہہ رہی ہو کہ میں نے تم پر احسان کیا ہے تو خدا کی قسم یہ الزام ہے۔ میں نے اس لیے تم سے شادی نہیں کی کہ تمہارے والد کے خیال کچھ اور تھے۔ یہ تو وہی جانتے ہوں گے کہ وہ کیا سوچتے تھے مگر میرے خیالات ہرگز وہ نہیں تھے۔ جیسا تم سوچ رہی ہو!" پتہ نہیں وہ بھی کیا اول جلول بک رہے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ رنگ زرد ہو چلا تھا۔ اور ہاتھ یوں کانپ رہے تھے جیسے رعشہ کے بیمار کے کانپتے ہیں۔ ان کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے گہرا غم جھانک رہا تھا!۔

عافیہ تکیہ پر اوندھی گر پڑی۔ اور سسک سسک کر رونے لگی۔!

مگر تب بھی بیرسٹر صاحب جوں کے توں بیٹھے رہے اسے روتے دیکھتے رہے۔

تمسخرانہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ تو سوچو کہ اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے سوائے اس کے شاید تم کو کوئی فائدہ پہونچ جائے۔ میرے والد کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ ان کا وارث جب تک گھٹنیوں چلے گا۔ وہ تو عدم آباد پہونچ چکے ہوں گے۔! اور کسے معلوم کہ ان کے یہاں لڑکا ہی ہو فرض کرو کہ لڑکی ہو گئی تو۔ ۔ ۔ ۔ !"

عافیہ جو کسی حد تک سنبھل چکی تھی بولی۔

"بہتر ہو کہ یہ تقریر آپ اپنے والد کے سامنے کریں۔ میں ایسی خوب صورت تقریر کا جواب نہیں دے سکتی۔!"

"بکواس مت کرو۔ تمھیں اس گھر سے جانا پڑے گا۔!"

"نہ میں آپ کی اجازت سے یہاں آئی ہوں اور نہ آپ کے حکم سے جاؤں گی۔!"

فاخرہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔!

اور عافیہ سر جھکا کر یوکلپٹس کے خوشبودار پھول چننے اور ان کی لمبی ڈنڈیوں سے ہار گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔!

فاخرہ نے دیکھا کہ اس کے گلے میں سونے کا بڑا سا ہار جگمگا رہا تھا اور یہ دیکھ کر تو اس کی آنکھوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں کہ عافیہ کی کلائیوں میں وہ طلائی مرصع کنگن تھے جو کبھی اس کی ممی کی کلائیوں میں ہوا کرتے تھے۔ سرخ و سبز سچے نگوں والے کنگن۔ اس کی ممی جب بھاری بھر کم ہو گئیں تو وہ کنگن اتار کے رکھ دیئے تھے۔ اور فاخرہ کے بار بار مانگنے پر بھی اس کے باپ نے یہ کنگن اسے نہ دیئے تھے۔ لیکن اب۔ وہی خوب صورت کنگن اس غیر لڑکی کی کلائیوں میں چمک رہے تھے!

فاخرہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ گلابی لباس میں وہ بھی صبح کی ایک نوخیز روشنی لگ رہی تھی۔ اس کے دل میں شعلے لپکتے رہے!۔ اگر یہ اس کے باپ کی منہ چڑھی ہے تو پھر اُسے کیا خاطر میں لائے گی؟۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے گھورتی رہی پھر چلی گئی۔! اور تب عافیہ نے گھٹنے پر پیشانی ٹیک دی اور اس کے گرم گرم آنسو سبزے پر ٹپکنے لگے۔ فاخرہ کا دل خراش طعنہ اسے بری طرح کھل رہا تھا۔ اس نے سچ ہی تو کہا تھا۔ غریب باپ نے چند ٹکوں کے احسان کے عوض اسے ایک امیر آدمی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اسے آج پھر اپنے مجبور ماں باپ اور مظلوم بھائی یاد آ گئے۔ پتہ نہیں کس حال میں ہیں۔ ماموں حمانی کے گھر انہیں دلی سکون حاصل ہے کہ وہ بھی اپنی دور افتادہ بیٹی کی یاد میں بیکل ہیں۔!؟

ابا جان۔ آپ کاش دنیا سے نہ جاتے۔
ہائے آپ کو میرا غم لے گیا۔ وہ کون سا ہاتھ تھا۔ جس نے میری ہنستی گاتی زندگانی میں آگ لگا دی۔!

پھر اس کے خیال کے رہوار اور آگے بڑھ گئے۔! اس منزل تک پہنچے جہاں دانش کی محبت کا شکستہ مزار تھا۔ اور پھر اسے اپنے آپ پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔! بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ اور سینے میں دم گھٹ رہا تھا دانش کا ہنستا ہوا چہرہ۔ پُر محبت باتیں۔ آخری ملاقات۔ اس کا بے پناہ تاثر۔ وہ اس ماحول سے دور چلی گئی۔
"عافیہ۔ یہ مدت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ تم مجھے پیار بھرے لمبے لمبے خط لکھا کرنا۔ اور اس آدھی ملاقات کے بعد پوری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ عافیہ۔! دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہ کر سکے گی۔ ہم ساتھ

جئیں گے اور ساتھ ہی دنیا سے جائیں گے۔"

اور اب ۔ انہیں خبر بھی نہیں کہ ان کی بدنصیب عافیہ پر کیا گزری ہے۔ وہ کس طرح جی رہی ہے۔ لمحہ لمحہ کی موت مرتی ہوئی۔ کاش یہ بات صحیح بھی ہوتی کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ورنہ کیا قیامت ہے کہ سه

یہ بھی ہے ماننے کی بات کوئی
مر مٹیں ہم تمہیں خبر نہ لگے؟

وہ بہت دور ہیں۔ جہاں میری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں میرا خیال نہیں جا سکتا۔ آہ۔ دل پر جو کچھ بیت رہی ہے۔ وہ کسی کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور خدا بے نیاز ہے۔ کون سنے گا آہ و فغاں، نالہ و فریاد۔ کون دیکھے گا دل کے داغ۔؟ کون ہے۔ کون ہے میرا ۔ اللہ۔ اللہ ۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ بے داغ و بیکراں نیلا آسمان ۔ حد نظر تک ۔ افق تا افق ۔ نجانے میرا خالق اس وقت کیا کر رہا ہے۔؟ اس کی نگاہیں مجھ پر ہیں کہ وہ کسی اور طرف مصروف ہے۔ اور جلتی ہوئی آہیں اس کے سینے میں چھالے ڈالنے لگیں۔

تبھی ایک ملازمہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔!

"صاحب زادی۔ آپ ناشتہ کر لیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ سرکار نے کہلوایا ہے ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ آرام کریں گے۔ البتہ آپ ناشتہ کر لیجئے۔!"

"کیا کر رہے ہیں وہ۔" عافیہ نے دوسری طرف چہرہ موڑ کر آنسو پونچھ لئے۔! اور لہجہ سنبھال کر پوچھا۔

"جی وہ صوفے پر لیٹے تھے! آپ چلئے مالکن۔ اب نو بجنے والے ہیں!"

"تم چلو۔ میں آتی ہوں۔!"

لڑکی کے جانے کے بعد وہ اٹھی اور طعام خانے میں جانے کے بجائے بیرسٹر صاحب کی خواب گاہ کی طرف ہولی۔!

اس کا گلابی چہرہ اور پُرنم آنکھیں دیکھ کر بیرسٹر صاحب چونک پڑے "کیا ہوا۔؟" وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے تپائی پر رکھ کر لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور کمبل الگ اچھال دیا۔!

"گلابو نے کہا کہ آپ کا جی اچھا نہیں ہے۔" عافیہ نے کہا۔

"طبیعت پریشان ہو گئی ہے۔ فاخرہ کی بے ہودگیوں نے سر میں درد پیدا کر دیا۔" بیرسٹر صاحب نے جواب دیا۔ "اب میں نے فاخرہ کی طرف سے اس کے شوہر کو فون کیا ہے کہ اگر وہ اسے آکے نہیں لے جاتا تو وہ اس پر دعویٰ کر دے گی۔!"

"مگر فاخرہ بیگم کو تو آپ کے فون کی اطلاع نہ ہو گی!" عافیہ نے سوچا کہ اچھا ہوا موضوع بدل گیا۔ بیرسٹر صاحب بڑے بے زار لہجے میں نجانے کیا کہہ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی انہوں نے کہیں اس کی روانگی کا انتظام تو نہیں کر دیا ہے!۔

"جاؤ تم کچھ کھا لو۔" انہوں نے کہا۔

"سنیئے۔!" اس نے سر جھکا کر اپنے ناخن تکتے ہوئے کہا۔

وہ اسے دیکھنے لگے۔

"رات میں نے۔ نجانے کیا بک دیا تھا۔" اس کا لہجہ کپکپا رہا تھا "آپ کو بُرا لگا ہو گا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔!"

بیرسٹر صاحب مسکرائے "جائز شکایتوں پر بُرا ماننا کیا۔ عافیہ

"آپ جیسا کہیں!"

"تمہارا جی چاہے تو ضرور جاؤ!"

"اکیلی۔؟"

"فی الحال۔ میں تمہارے پاس پہونچنے کی کوشش کروں گا۔ تمہاری امی سے ملنے کا میرا بھی بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن میری طبیعت چوں کہ خراب ہے۔ اور ۔۔۔!"

"آپ جب بلائیں گے۔ میں چلی آؤں گی۔!۔" عافیہ نے کہا۔ اور کمرے سے نکل آئی۔ طبیعت کی خرابی۔ اس کے دل میں آگ سی بھر گئی ساری زندگی ہی بیماروں کے درمیان گزر گئی۔ کسی خوشی کا مُنہ نہ دیکھا انہیں ضرورت ہی کیا تھی۔ اس ہمدردی کی۔ وہ کسی کنویں کھائی کی تہہ میں پناہ لے لیتی۔ زندگی تو اب بھی ایک اندھے کنویں میں گزر رہی ہے۔!

شام کو وہ اپنی روانگی کی اطلاع دے کر چلی گئی!

بیرسٹر صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ کم از کم وہ ان سے مل کے تو جاتی وہ اسے باندھ کے تو نہ رکھ لیتے۔! بڑی اکتائی ہوئی تھی وہ۔ اس ماحول سے بے زار ۔۔ ان سے گریزاں۔

اُف۔ یہ میں نے کیا کیا۔ کیوں تھام لیا اس کا ہاتھ۔ مجھے کیا ملا ہے سوائے ناقابل تلافی پچھتاؤں کے۔!

وہ خیالوں کے بیمار تھے!۔ دماغ ماؤف، دل متاثر، جسم پر اضمحلال سا طاری۔ فاخرہ پرسش کے لیے آئی تھی مگر بیرسٹر صاحب نے اس سے بات بھی نہ کی۔! تھوڑی دیر بعد راحیل کا فون ملا۔! وہ فاخرہ کو ساتھ

رکھنے پر راضی نہ تھا۔ اس بات پر آمادہ تھا کہ مقدمہ لڑتا رہے!۔ فاخرہ کو پتہ چلا۔ وہ خوب چیخی چلائی۔ بیرسٹر صاحب کو برا بھلا کہا کہ وہ باپ ہو کر ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھے!!۔

عافیہ کے جانے کے بعد بیرسٹر صاحب عجیب سے دیوانے ہو کر رہ گئے۔ اب تو وہ کوئی کام ہی نہ کرتے تھے۔ گھنٹوں اپنے کمرے میں بند پڑے رہتے۔ اگر ملازم کمرے ہی میں کھانا پہونچا دیتے تو برائے نام کھاتے۔ اگر کوئی غسلخانہ تیار ہونے کی اطلاع دیتا تو نہا لیتے۔ اور پھر مریضوں کیطرح آرام کرسی پر آکے لیٹ جاتے!۔

اب بھی وہ اندرونی بیماری جو انہیں تھی اور کچھ نامعلوم سی تھی۔ انہیں دیمک کی طرح چاٹے ڈالتی۔ پرانی ملازمہ جو انہیں سسرال سے ملی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلانے کی تاکید کی۔ مگر بیرسٹر صاحب نے کہا کہ انہیں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔

فاخرہ پیچ وتاب کھاتی۔ بڑھاپے کے جوان نخرے۔ خدا غارت کرے۔ وہ بلا گھر سے بہہ گئی ہے نا۔ بڑے میاں نے اس کی مفارقت میں کھانا پانی چھوڑ رکھا ہے۔ اس کی اولیں اور آخری خواہش یہی تھی کہ اب عافیہ اس گھر میں نہ آئے۔

اس نے بڑی تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ ڈیڈی بڈھے آدمی ہیں کب تک جئیں گے۔ وہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہونے دے گی کہ ان کا کوئی وارث بھی پیدا ہو جائے۔ آخر ڈیڈی کو اسی سے کیا بیر ہے کہ وہ اسے اپنی جائیداد کا وارث بنانا نہیں چاہتے۔ ہوس اور حرص۔ اور کیا۔ لیکن اس کے سامنے تو اس کا اور اپنی بچی فائزہ کا مستقبل

کیا کیا مصیبتیں پڑتی ہیں۔ اگر سب لوگ تمہارے ہی ایسے ہو جائیں تو پھر چل چکی یہ دنیا۔ بیٹا تم نے کیا سوچا ہے آخر۔ یونہی آدم بیزار خانہ نشین بنے رہو گے نہ شادی بیاہ کرو گے نہ ــــ!"

دانش کے چہرے سے بیزاری اور احتجاج عیاں تھا۔! "کون سا ایسا فرق پڑ جائے گا۔ ایک میرے دنیا میں دلچسپی نہ لینے سے دنیا سونی تو نہ ہو جائے گی۔ دنیا کو میری کیا پرواہ ہے۔" وہ بیحد طنزیہ انداز میں ہنسے

فردِ واحد کی اس آشوب میں قیمت کیا ہے
نفسِ گل کی بیاباں میں حقیقت کیا ہے

میں نے دنیا اور دنیا والوں کو دیکھ لیا۔ اب مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ میں اسی طرح رہی سہی بھی گزار دوں گا۔ آپ مجھ پر اپنے الفاظ نہ ضائع کیجئے۔ سمجھ لیجئے کہ آپ کے صرف چار ہی بیٹے تھے۔ صبر کر لیجئے امی۔ اب میں آپ کی اس دنیا میں واپس نہیں آؤں گا جس نے مجھے جلن اور تپش کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔!"

"مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارے دکھ سے ہونا کیا ہے؟"

"دکھ بھی تو جینے کا ایک سہارا ہے۔!"

"اللہ نہ کرے کہ تمھیں دکھ ہو۔ بیٹا۔ میرے دل پر تو پہاڑ آ گرے ہیں مجھ سے تمھاری اداسی برداشت نہیں ہوتی!۔ مان لو میری بات۔ میں کوئی ناگوار مشورہ نہ دوں گی۔ میاں۔ میں ایک پیاری سی لڑکی سے تمھاری شادی کر دوں گی۔ تمھارے اللہ رکھے بچے ہوں گے۔ تمھارا دل بہلے گا تب تم سوچو گے تم کتنی بھول میں پڑے تھے۔ اگر تم کہو تو اپنے پڑوسی پرنسپل صاحب کی لڑکی رعنا کے لیے ــــ!"

دانش نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ "بالکل نہیں! آپ سے میں کہے دیتا ہوں۔ آپ جو کچھ کریں گی۔ اس کی ذمہ دار صرف آپ ہوں گی مجھے شادی دادی نہیں کرنی ہے۔! تھوڑے دنوں تک اپنے دکھ کے ساتھ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں!۔"

"کچھ فائدہ ہے اس سے۔؟" وہ غصّے سے بولیں۔

"مجھے فائدے نقصان سے بھی غرض نہیں:"

"تو پھر یہ تمہارا وطیرہ کیا ہے؟"

"صرف احساسِ بے بسی۔ کاش وہ نہ ہوتا جو ہوا ہے۔!"

"اب تمھارے احساس سے کچھ ہونے کا تو نہیں ہے نا۔ پھر تم احساس کر کے کیا کرو گے۔"

"وہ کرب اپنے آپ پر محسوس کرتا ہوں۔ جو کسی ناکردہ کار کے گلے پر چھری پھرتے وقت اس نے اپنے دل پر کیا ہوگا۔!"

بیگم ظہیر کو خوف ہوا۔ کہیں دانش کا دماغ تو ماؤف نہیں ہو گیا۔ الٹی سیدھی کچھ نہیں مانتے!۔ غصّے سے، منّت سے۔ ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا۔ ظہیر صاحب نے بیوی کا رونا دھونا سن کر بہت ناراضی کا اظہار کیا بولے: "اگر تم یہ چاہتی ہو کہ وہ تمھارے اس طرح پیچھے پڑنے سے گھر چھوڑ کر چلے جائیں تو فکر مت کرو۔ تمھاری آرزو ضرور پوری ہو گی۔ پھر تم اطمینان سے رویا کرنا۔!"

"اللہ نہ کرے۔!" انہوں نے بُرا مانا۔ پھر بولیں "میں کہتی ہوں۔ رعنا کے لیے آپ دانش سے کہئے۔ وہ بے حد اچھی طرح لڑکی ہے۔ سلیقہ مند، گرہستی چلانا اسے خوب معلوم ہے۔ میں تو دیکھتی ہی رہتی ہوں کہ اپنے

بڑے ہنس مکھ خوش مزاج تھے۔ ان کی وجہ سے گھر بھر میں ایک زندگی سے معمور فضا طاری رہتی تھی نہ کہ اب اس کے برعکس تھا۔ اجب تک وہ اپنے کمرے میں بند رہا کرتے۔ یوں لگتا۔ گھر میں کوئی جنازہ موجود ہو۔ سب کا ہنسنا بولنا یک قلم بند۔ منہ اس وقت کھلتے جب دانش باہر چلے جاتے

ایسے ہی وقت میں جب کہ ان کا کمرہ بند تھا۔ بیگم ظہیر نے اپنی عقل کی رہبری قبول کرتے ہوئے پڑوس کی لڑکی رعنا کو بلوا بھیجا۔ وہ یوں بھی اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ مگر اس روز جو آئی تھی وہ بیگم ظہیر کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت۔ دیر تک وہ چپکے چپکے اس سے باتیں کرتی رہیں کچھ آنسو پونچھے اور نجانے کیا کیا کہتی رہیں کہ بار بار رعنا کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا۔!

وہ لگ بھگ بیس بائیس برس کی قبول صورت دوشیزہ تھی۔ امتوسط طبقہ کی فرد تھی۔ اور اپنی عمر کے اس حصے میں جہاں رنگ برنگی خواب خود بخود ذہن کے ہر گوشے سے اپنی جھلک دکھانے لگتے اور تعبیر کی خواہش کرنے لگتے ہیں!۔ یہ عمر محبت اور اس کے عواقب سے بے پرواہ ہوتی ہے۔ لہذا اس نے بھی دانش کے دل خوش کن تصور میں ڈوب کر بیگم ظہیر کے پلان پر عمل کرنے پر حامی بھر لی۔! اس روز وہ دیر تک اپنے گھر نہیں گئی۔ بلکہ جب بیگم ظہیر "سر کے شدید درد" میں مبتلا سر پر رومال کس کے سامنے ہی تخت پر لیٹ گئیں تو وہ ازراہِ ہمدردی باورچی خانہ سنبھالنے پہونچ گئی۔!

بیگم ظہیر چپکے چپکے مسکراتی رہیں۔ انہیں یقین تھا کہ رعنا کی سی جاذب نظر ہوشیار اور معاملہ فہم لڑکی ضرور بگڑی بنا دے گی۔ ویسے انہوں نے بہت دُور تک سبق بھی پڑھا دیا تھا۔! اور سمجھا دیا تھا کہ دانش کا دل جیتنے۔ انہیں سنیاس سے سنسار کی طرف لانے کا مطلب ہے۔ اس گھر اور دلی عہد

بہادر کی ذات پر مالکانہ قبضہ۔! چنانچہ رعنا نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ جی جان سے دانش کا غم بھلانے کی کوشش کرے گی۔!

دانش کا انتظار صبر آزما ہو گیا۔ بیگم ظہیر سر پہ رومال کسے کسے بور ہو گئیں اس عرصہ میں ظہیر صاحب آئے اور کھانا کھا کے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔!

"خالہ اماں۔ وہ تو آئے نہیں ابھی تک۔!" رعنا بھی کچھ اکتا گئی۔ "مجھے گھر سے آئے بڑی دیر ہو گئی۔! اماں نے پوچھا تو کیا کہوں گی۔؟"

"بیٹے انہیں پتہ ہے کہ میرے گھر کا کارخانہ مردوں کا ہے۔ اللہ رکھے سب ہی اپنے اپنے کام سے چلے جاتے ہیں۔" بیگم نے کہا۔ "تم بہن سے کہہ دینا خالہ کے سر میں درد اور بخار تھا۔ ڈاکٹر نے ہفتہ بھر آرام بتایا ہے۔ اس لیے تم ذرا روز میرا ہاتھ بٹانے آ جایا کرو گی!۔"

"مگر مجھے خود بھی کچھ خوف لگتا ہے۔ خالہ اماں۔!" وہ کھسیائی سی ہنسی ہنس دی۔

"اے بیٹی۔ خدا کی رحمت تم پہ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو میں خود ہی نہ کہتی۔ مگر یہ تو ثواب ہے۔ تم کسی کی جان بچا رہی ہو۔!"

"تو کیا۔؟"

"ہاں بی بی۔" وہ آب دیدہ ہو گئیں۔ "دم پر بن گئی ہے ان کے"

پھر اچانک دانش آ گئے اور دونوں چپ ہو گئیں۔ رعنا یہاں کے لیے نئی نہ تھی۔ ہمیشہ وہ اس سے مزاحیہ انداز سے باتیں کرتے تھے۔ مگر اب ان کی تیوریاں چڑھ گئیں اور انہوں نے بڑے ناگوار انداز میں اسکے سلام کا جواب دیا۔ ماں کو دیکھا کہ سر پر رومال کسے کراہ رہی ہیں۔ لیکن

"یہ عجب تماشہ ہے۔ کسی ہمدردی سے بری حالت دیکھی نہیں جاتی۔ پھر بھی دیکھنے چلے آتے ہیں۔ بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب ہمسایوں تک میری زبوں حالی کی اطلاع پہونچ چکی ہے۔ اور وہ بھی ہمدردی اور محبت کے مارے مجھ زندہ کی تعزیت کے لیے چلے آتے ہیں۔!"

رعنا کی محبت کا قطب مینار دھم سے زمین پر آرہا۔ ایسا اکل کھرا! آدمی اس نے کاہے کو دیکھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خالہ اماں کو صلواتیں سنائیں۔ اور خود پیچ و تاب کھاتی باہر آئی۔!

"وہ نہیں کھا رہے۔ سینی میز پر رکھی ہے اٹھا لائیے گا۔ میں گھر جا رہی ہوں۔" اس نے خاصی برہم آواز میں کہا اور شال سنبھال کر صحن میں نکل آئی۔ رومال نوچ کر خالہ اماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "کیا ہوا۔ بیٹی ٹھہرو۔ سنو تو۔ ارے کہاں چلیں۔" مگر بیٹی بگڑ کر چل دیں۔!

اس ایک ایکٹ کے رومان نے دانش کا موڈ بھی چوپٹ کر دیا۔ امی نے مجھے تماشہ بنا لیا ہے۔ انہوں نے بھی بگڑ کر سوچا۔ اور پھر اٹھ کر باہر چلے گئے پبلک پارک میں جہاں آخری مرتبہ وہ عافیہ سے جدا ہوئے تھے۔ اکثر وہ آبیٹھتے تھے۔ اور اپنے ذہن میں اس ملاقات کی تمام یادوں کو اکٹھا کیا کرتے۔! یہ یادیں کربناک بھی تھیں اور طرب ناک بھی۔ اس گوشۂ چمن میں آکر وہ دنیا ما فیہا کو بھول جاتے تھے۔ انہوں نے سچی محبت کی تھی اور سچی محبت کی معراج یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ناکام رہے۔!

سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سر شام اچھی خاصی خنکی ہونے لگتی۔ اور یہ تو باغ تھا جہاں سبزے کی ٹھنڈک، درختوں سے آنیوالی ہوائیں اور کھلی ہوئی جگہ موسم کی شدت کو زیادہ شدید کرنے میں خاصی

مدد دیتی تھیں۔! لیکن دانش موسم کی بے پناہی اور ماحول سے یکسر لاپرواہ اپنے محبوب ہار سنگھار کے پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔!

انہیں باغباں نے متوجہ کیا۔ "صاحب شام ہوگئی ہے۔ آپ اٹھ کے بنچ پر بیٹھ جائیے۔ اس جھنڈ کے پیچھے سانپ کا بل ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں۔!"

وہ لمبی سانس لے کر اٹھے اور دیکھا کہ آس پاس خاصہ اندھیرا ہو گیا تھا اور گیسٹ ہاؤز میں مرکیوری بلب روشن ہو چکے تھے۔!

"آپ کے لیے کچھ کافی بسکٹ لاؤں صاحب؟۔" مالی نے پوچھا

"نہیں بھائی۔ کیا تم مجھے پہچانتے ہو۔؟"

"جی صاحب۔ کچھ مہینوں پہلے آپ کے ساتھ وہ جو بی بی تھیں۔ ان کے لیے میں ہی تو چائے لایا تھا۔!" وہ ہنسنے لگا۔ "وہ اب کہاں ہیں صاحب"

"پتہ نہیں۔ دنیا کے میلے میں وہ کھو گئیں بھائی۔!"

مالی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی اس نے خوشامدانہ انداز میں دانت نکال دیئے۔ اور بولا:

"اچھا صاحب۔ اب چلتا ہوں۔ گیسٹ ہاؤز میں کوئی وکیل صاحب آکے ٹھہرے ہیں۔ چوکیدار چلا گیا ہے۔ وکیل صاحب کی خدمت مجھے کرنی پڑتی ہے عجیب مزاج ہے صاحب۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ اب حکم دیا تھا کہ رائل ہوٹل سے ان کے اور ان کے دوستوں کے لیے بریانی لے کے آؤں۔ جا رہا تھا کہ آپ کو دیکھا۔ آپ کچھ بیمار دکھائی دے رہے ہیں صاحب!"

"نہیں بھائی۔ شکریہ۔ میں ٹھیک ہوں۔!" دانش کے دل میں اچانک ایک چراغ سا جل اٹھا۔ انہوں نے دس روپے کا ایک نوٹ

باغبان کی طرف بڑھا دیا۔ اور مسکرا کر بولے: "میری طرف سے تم بھی بریانی کھا لینا۔ اب میں بھی چلتا ہوں۔"

باغبان خوش ہو گیا!

دانش کے دماغ میں ایک بار پھر آندھیاں سی چلنے لگیں۔ باغباں نے کسی بڑے بوڑھے وکیل صاحب کا تذکرہ کیا تھا۔ تب دانش کو اچانک وہ وکیل صاحب یاد آ گئے جو کریمی صاحب کے گہرے دوست تھے۔ اور جنھوں نے دیرینہ رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے کریمی صاحب کا اتنا ساتھ دیا تھا کہ بقول عافیہ کے کریمی صاحب کے سر اٹھانے کی جگہ نہ رکھی تھی! شاید وہ کریمی صاحب کے پورے خاندان پر گزرنے والے حادثے سے بے خبر نہ ہوں۔! شاید انہیں پتہ ہو کہ عافیہ کہاں چلی گئی تھی۔ کیا وہ انہیں بتائیں گے نہیں؟۔ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ عافیہ ان کی منگیتر ہے۔! وہ منگنی کی رسم میں شریک بھی تو تھے۔ اور خود بھی ہار پھول اور مٹھائی لے گئے تھے۔ دانش کو بہت سی مبارک باد دی تھی۔!

یقیناً۔ یقیناً۔۔ دانش کی سانسیں پھولنے لگیں۔۔ وہ وکیل صاحب یقیناً سب کچھ جانتے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ۔۔ عافیہ کا ہاتھ کس نے تھاما ہے۔!؟

لیکن۔ ان کے دل میں جلتے ہوئے چراغ پھر بجھنے لگے۔ اگر انہوں نے بتا بھی دیا تو کیا؟۔ آخر وہ اس کی تلاش میں کیوں برباد ہو رہے ہیں۔ یہ تو ابنی بے تابی ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ عافیہ اپنے نجات دہندہ کے ساتھ خوش ہو۔! اس کا احسان مانتی ہو۔ مگر وہ کون فرشتۂ رحمت ہے۔ جس نے عافیہ کو تحفظ دیا ہے۔ عزت دی ہے۔ پناہ دی ہے۔ اس کا دیدار کر لینا تو پاگل پن نہیں ہے۔! بس یہ بے کلی دل کی کم ہو جائے گی۔ کچھ سکون ملے گا۔ اور شاید عافیہ کی

اور دوسرے ہی منٹ انہیں ڈرائنگ روم میں بلا لے گیا، تھوڑی دیر بعد بیرسٹر صاحب پردہ ہٹا کے ڈرائنگ روم میں آئے۔!

" آداب عرض کرتا ہوں جناب!" دانش نے کہا۔

" آداب عرض۔ میاں آداب عرض۔ جیتے رہئے!" بیرسٹر صاحب نے کچھ حیرت سے کہا۔ اور مصافحہ کے خاطر دانش کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

جب وہ بیٹھ گئے تو بیرسٹر صاحب نے کہا۔ " معاف کرنا میاں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ میں تو یہ سمجھا کہ میرے اپنے فیملی ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں ویسے۔ آپ کی آواز کچھ سنی ہوئی سی لگتی ہے۔! یہ جو کچھ ہفتوں قبل میری ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگی تھی۔ اس نے کسی قدر حافظے کو بھی متاثر کیا ہے۔ بہرحال فرمائیے!۔"

" آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ تعجب ہے۔ بیرسٹر صاحب۔ میں دانش ہوں"۔

" دانش۔ ڈاکٹر دانش ؟۔" بیرسٹر صاحب بہ ایں وزن و وقار گویا اچھل پڑے۔ اور ایک مرتبہ اوپر سے نیچے تک دانش کو گھورا۔ انہوں نے ابھی تک انہیں ایک باسلیقہ اور نفاست پسند آدمی کے روپ میں دیکھا تھا۔ اور اب بیرسٹر صاحب کو تعجب تھا۔ دانش گھر کے پاجامہ اور ملگجے سے ململ کے کرتہ میں کیسے ؟۔ بہرحال وہ خاموش رہے اور ادھر دانش بھی یکبارگی گم صم سے اپنے منتشر خیالات کو سمیٹتے رہے۔ ان سے کیا پوچھنا ہے۔

بیرسٹر صاحب نے کہا:

" آپ تو اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ میں نے سنا تھا کہ۔ جرمنی یا امریکہ کہیں چلے گئے تھے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ ـــ!"

" جی ہاں۔" دانش کو بات آگے بڑھانے کا ایک سرا مل گیا۔ " میں اٹلی گیا

تھا مگر ۔ ایک خاص وجہ سے اپنی تعلیم پوری نہیں کر سکا ۔! وجہ آپ بھی جانتے ہیں۔"
"میں بھی جانتا ہوں ۔ ؟! ۔" بیرسٹر صاحب نے متحیرانہ لہجہ میں کہا۔
"جی ہاں ۔" دانش نے کہا۔ "مجھے اٹلی میں والدہ صاحبہ کے خط سے چچا صاحب کے کنبہ پر نازل ہونے والی قیامت کا پتہ چلا تھا۔ میرا اس گھرانہ سے بہت گہرا ربط رہا ہے۔ جناب ۔ اس خاندان کے اس انتشار نے مجھ پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ پڑھائی میں میرا دل نہیں لگا ۔! میں تو بہت دنوں پہلے ہی یہاں آ گیا ہوں ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ۔ مجھے اصلی حالات کا علم ابھی تک نہیں ہو سکا حالانکہ میرے والد ظہیر صاحب بھی چچا صاحب کے پرانے دوستوں میں سے تھے ۔ مگر پورے واقعات کا علم انہیں بھی نہیں ۔ اس لیے ۔ میں آپ سے ملنے آیا ہوں کہ آپ ۔ !"
ایک تھرتھری سی بیرسٹر صاحب کے عظیم الشان جثہ میں یوں بھر گئی جیسے کھوکھلے گنبد میں ہوا بھر جائے ۔! انہیں اپنا دل دھڑکتا اور کان گرم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے ۔! اپنی اس کیفیت کو چھپانے کے لیے انہوں نے سگریٹ سلگا کر بہت گہرا دھواں چھوڑا اور پھر سگریٹ کیس لائیٹر دانش کی طرف بڑھا دیا۔
"جی ۔ شکریہ ۔" دانش نے کہا ۔ اور دونوں چیزیں ان ہی کی طرف سرکا دیں
بیرسٹر صاحب چپ ہی بیٹھے رہے تو پھر دانش نے کہا :
"یہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ پورے حالات مجھے معلوم بھی ہو جائیں گے تو میں کیا کروں گا ۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا ہے ۔ لیکن یہ میرا خبط ہے ۔ دیوانگی ۔ جو تعلق مجھے چچا صاحب کی ذات سے تھا ۔ وہ تو تھا ۔ لیکن ۔ قبلہ ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۔ ان کی لڑکی ۔ حافیہ میری منگیتر تھی ۔ یہ آپ سے کہنے کی بات نہیں ہے ۔ کیونکہ آپ بھی تو اس وقت وہاں موجود تھے ۔ جب ہم ایک مبارک بندھن میں باندھے گئے تھے ۔! میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ ۔ آخر وہ کون سی

وجوہات تھیں کہ اس قدر جلد عافیہ کو کسی اور گھر میں جھونکنا پڑا۔ کیا وہ لوگ میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ کیا مجھے تمام باتوں سے باخبر نہیں کر سکتے تھے۔ میں فوراً چلا آتا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلا آتا جیسے کہ اب آگیا ہوں۔ انہیں مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کیوں نہ رہا۔ کیا میں عافیہ کو پناہ نہ دیتا۔ کیا اسے اپنا نہ لیتا۔ مجھے بتائیے۔ بیرسٹر صاحب۔ خدا کے لیے بتایئے۔!"

"کیا بتاؤں؟" بیرسٹر دم بخود تھے

"آپ بھی چچا صاحب کے پرانے دوست ہیں۔" دانش نے کہا۔ بالکل از خود رفتہ ہوئے جا رہے تھے۔ "ساری تباہی آپ کی نظروں کے سامنے گزری ہو گی۔!! کیا آپ کو پتہ نہیں کہ وہ بدنہاد بزدل بدمعاش کون تھا جس نے ایک مسرور کنبہ کی بہاروں کو ابدی خزاں میں بدل کر رکھ دیا۔ کچھ اس کا پتہ چلا بیرسٹر صاحب؟۔"

بیرسٹر صاحب نے مشکوک نگاہوں سے انہیں گھورا۔ مگر دانش کے چہرے پر سوائے دکھ۔ یاس اور غم کی بے پناہی کے اور کچھ نہ تھا۔!

بیرسٹر صاحب نے ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اپنا کانپتا ہوا لہجہ سنبھال کر جواب دیا:

"نجانے میاں آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اس شخص کا پتہ چل جاتا۔ جو ان تمام بربادیوں کا ذمہ دار ہے تو کیا ہم لوگ اسے سزا دیئے بغیر چھوڑ دیتے۔!؟"

"عافیہ نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کوئی نشانی کوئی علامت نہیں بتائی ایسی کہ کسی کا پتہ چل سکتا!۔"

"میں اس سلسلہ میں کیا بتا سکتا ہوں۔" بیرسٹر صاحب نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ کتنا پاگل ہو رہا ہے۔ مجنوں لگ رہا ہے۔ داڑھی بڑھی ہوئی، لباس واہیات،

لہجہ ڈانواڈول، دماغ بے ٹھکانے۔ کیا واقعی اسے عافیہ سے سچی محبت تھی؛ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "شاید کچھ کہا ہو۔ اپنے والدین سے میں تو نہ عافیہ سے اتنا قریب تھا اور نہ وہ مجھ سے بے تکلف تھیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اب بعد از وقت آپ کی اس ساری تفتیش کا مطلب کیا ہے؟"

"بیرسٹر صاحب۔ مجھے آپ سے کہنا نہیں چاہئے۔ آپ بھی میرے ویسے ہی بزرگ ہیں جیسے چچا صاحب تھے یا میرے والدہ ہیں۔ لیکن پھر میں نہیں جانتا کہ میں کس کے سامنے آنسو بہاؤں۔ کس کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں، کسے اپنی داستانِ غم سناؤں۔ میرا ہے ہی کون؟ دانش کی آواز بھرّانے لگی۔" بیرسٹر صاحب۔ میں آپ کے پاس اسی لیے تو آیا ہوں کہ آپ مجھے بتائیے۔ اب عافیہ کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے۔ وہ جہاں کہیں ہے خوش تو ہے؟ اسے کبھی کوئی غم تو نہیں ستاتا۔ اسے مجھ بدنصیب کی یاد تو نہیں آتی۔ وہ اپنی تباہی پر دل شکستہ اور گم صم تو نہیں ہے۔ اسے اس ظالم دنیا کا ایک ستم سمجھ کر بھول چکی ہو یا بے آبروئی کا داغ اس کا جگر کھرچتا رہتا ہے۔ مگر۔ آپ کیا جانیں اس کے دل کا حال۔ کون جان سکتا ہے۔"

بیرسٹر صاحب دانش کو دیکھے جا رہے تھے۔ کیوں یہ آدمی اس قدر دیوانہ بنا جا رہا ہے؟

دفعتہً اندر دالان میں کسی نے ریڈیو گرام آن کر دیا۔ بڑی گھن گرج تھی پھر ایک مغموم سا نغمہ فضا میں گونجنے لگا۔ ؎

دنیا بدل گئی مری دنیا بدل گئی
ٹکڑے ہوئے جگر کے چھری کا دل پہ چل گئی

دنیا بدل گئی مری دنیا بدل گئی

ایسی ہوا چلی کہ خوشی غم میں ڈھل گئی

برباد ہو گیا میری امید کا چمن
جس ڈال پہ کیا تھا بسیرا وہ جل گئی

دل خاک ہو گیا یہ کسی کو خبر نہیں
سب یہ سمجھ رہے ہیں تمنا نکل گئی

دنیا بدل گئی مری دنیا بدل گئی

دفعتہً دانش کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔! انہوں نے اپنے گریۂ بے اختیار پر قابو پانے کی کوشش کی مگر آنسوؤں کی لڑیاں ان کے گالوں پر بہہ نکلیں۔! اور ایک سسکی لے کر انہوں نے رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔

بیرسٹر صاحب پر ایسا سناٹا طاری تھا کہ کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ بول سکے!۔ پھر دانش نے آنسو پونچھے اور آواز سنبھال کر بولے:

"معاف کیجئے۔ میں اتنا بے ضبط ہو گیا۔ اتنا آپ کا وقت ضائع کیا مگر اصلی بات آپ سے نہیں پوچھی۔!

"کون سی بات ہے؟۔" بیرسٹر صاحب نے نزع کے سے عالم میں پوچھا

"اس شخص سے تو آپ واقف ہوں گے جس نے عافیہ کو پناہ دی اور اس کا ہاتھ تھاما ہے!۔" دانش کا لہجہ بھیک مانگ رہا تھا۔ "وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟"

بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "نہیں۔ میں نہیں جانتا۔!"

"آپ نہیں جانتے؟۔ آپ موقعہ پر موجود نہیں تھے۔؟"

"نہیں۔! یہ تو مجھے بعد کو کریمی صاحب سے پتہ چلا کہ انہوں نے لڑکی کا ٹھکانہ کر دیا تھا۔ میں ان سے نہیں پوچھ سکا کہ وہ شخص کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔؟ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب یہ سب کچھ تم

کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد ہے؟"

"جی ہاں ۔!" دانش نے ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا ہے ۔؟" بیرسٹر صاحب نے انہیں عجیب نظروں سے گھور رہے تھے

"یہ میں جانتا ہوں ۔ بیرسٹر صاحب ۔ عافیہ کا لگاؤ مجھ سے سطحی اور جذباتی نہ تھا ۔ وہ واقعتاً مجھے ۔ مجھ سے گہرا انس رکھتی تھی ۔ اس نے ایسی قسمیں کھائی تھیں مجھے ہر طرح یقین دلایا تھا ۔ عہد کیا تھا ۔ کہ وہ ہمیشہ میری ہی رہے گی ۔ وہ اپنی قسمیں اور وعدے بھولی نہ ہوگی ۔ لیکن مجبور ہو گی بھلانے پر ۔! اور اگر وہ مجبور رہے ۔ اور اب بھی اس کے محسوسات میرے بارے میں وہی ہیں جو تھے تو میں اس شخص سے التجا کروں گا کہ اگر وہ مجھ پر اور عافیہ پر رحم کرے ۔ ہمارے درمیان سے ہٹ جائے تو میں زندگی کی آخری سانسوں تک اس کا شکرگذار اور احسان مند رہوں گا ۔ !"

"کیا مطلب ۔؟" بیرسٹر صاحب کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹنے لگا ۔"تم اس سے یہ کہو گے کہ وہ تمہارے حق میں اپنی بیوی سے دست کش ہو جائے؟ کیسی عجیب بات ہے؟! حق تلفی، احسان فراموشی ۔ جس نے اسے پناہ دی ہے ۔ وہ اس سے کیوں کر دست بردار ہو گا ۔ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ ۔۔! "

"آپ قانونی آدمی ہیں بیرسٹر صاحب ۔ آپ اس معاملہ کو بھی قانون کی نظر سے دیکھ رہے ہیں ۔ لیکن آپ نے حق اور انصاف بھی تو کیا ہو گا ۔ حق اور انصاف کی نگاہ سے دیکھئے ۔ زیادہ مستحق وہ شخص ہے کہ ۔ زیادہ میں ۔؟ کیا ہوا اگر اس نے ان ہنگامی حالات میں اس کا ہاتھ تھام لیا ہے ۔ میں تو اسے ساری زندگی کا تحفظ دوں گا ۔!"

"مگر ۔ میں اس سلسلہ میں کیا کر سکتا ہوں ۔" بیرسٹر صاحب کا جھرایا

ہوا چہرہ زرد ہو گیا۔ اب وہ دانش سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔!
"آپ سے میری صرف یہی درخواست ہے کہ آپ براہ کرم اس شخص کا نام اور پتہ مجھے بتا دیجئے۔ میں آپ کا بھی احسان مند رہوں گا۔!"
"اگر اس شخص نے عافیہ کو آزاد کر دیا تو کیا تم — !"
"جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں اسے اپنا لوں گا۔" دانش پھر گھگھیائے۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اگر کسی ہیرے کو کوئی کیچڑ میں پھینک دے تو اس کی چمک دمک میں کوئی فرق آتا ہے۔ میں اتنا کم ظرف، تنگدل اور تاریک خیال نہیں ہوں بیرسٹر صاحب۔ آپ نے معاف کیجئے گا۔ ساری زندگی قانون کی خشک اور ثقیل دفعات کا مطالعہ کیا ہے۔ تعزیرات ہند میں محبت اور ایثار کا کوئی باب نہیں ہے۔ آپ ان کی لطافت بھی نہیں جانتے۔ مگر میں — !"
"صاحبزادے،" بیرسٹر صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ "جو کچھ تم نے کہا وہ سب صحیح، بجا، درست۔ مگر میں اس سلسلہ میں تمہاری کوئی رہبری نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میں تمام حالات سے قطعی لاعلم ہوں۔!"
اور موہوم سی امیدوں کی وہ روشنی جو دانش کے چہرے کو منور کئے ہوئے تھی۔ آناً فاناً بجھ گئی۔ وہ پھر اندھیروں میں بھٹکنے لگے۔ ناممکن تھا کہ ایک معزز، معمر، ثقہ بزرگ اس سنجیدہ معاملہ میں غلط بیانی سے کام لیتے اور ضروری ہی کیا تھا کہ وہ لاعلمی اور بے خبری کا سہارا لیتے۔؟ دانش ایمان لے آئے کہ وہ سب کچھ سچ ہی کہہ رہے ہیں۔ پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ مردہ آواز میں پوچھا۔ "یہ بھی آپ کو پتہ نہیں کہ پھر حمزہ اور ان کی والدہ کہاں گئے۔؟"
"میاں۔ میں نے تم سے کہا نا کہ میں سب باتوں سے لاعلم ہوں۔ میں

غالبًا اس زمانے میں مقدمہ کے سلسلہ میں کہیں باہر چلا گیا تھا۔ اور واپس آیا تو پتہ چلا کہ کریمی صاحب کے خاندان کا تختہ ہی الٹ چکا ہے۔ کریمی صاحب کے انتقال کے چار پانچ روز بعد ہی ان کی بیوہ اور لڑکا اپنے کسی عزیز کے پاس چلے گئے۔!“

”اوہ۔“ دانش نے سر جھکا لیا۔

اتنے میں ملازم نے کافی لگا دی۔ اور مؤدبانہ انداز میں اطلاع دی۔

”آؤ۔ دانش میاں۔ ایک پیالی کافی۔!“ بیرسٹر صاحب نے کہا۔

”آپ کا شکریہ۔ جناب۔! معافی چاہتا ہوں۔“ دانش نے کہا اور رخصتی سلام کر کے کمرے سے نکل گئے۔!

بیرسٹر صاحب ہکا بکا کھڑے رہ گئے۔!

ان کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے اب تک جو کچھ کیا، وہ سب کیا تھا۔؟ اچھے اور برے کام کی تخصیص مٹ چکی تھی۔ کچھ ایسے خیالات تھے۔ جن کا تجزیہ مشکل تھا۔! بہرحال وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ دانش کی حالت پر رہ رہ کر انہیں افسوس ہوتا اور حیرت کے جذبات بھی غالب آجاتے۔!

وہ مرے مرے قدموں سے چل کر صوفہ پر آبیٹھے۔ اور سوچنے لگے۔ اپنی اتنی طویل عمر انہوں نے کن اعمال میں گنوائی۔ جیسے جیسے سوچتے گئے۔ فردِ عمل ان پر خندہ زن ہی نظر آئی۔ کوئی کام ایسا دکھائی نہیں دیا جس پر وہ نازاں یا مفتخر ہو سکتے۔ اور یہ۔ ڈھلتی ہوئی عمر کا چڑھتا ہوا کارنامہ — ان کی پیشانی پسیجنے لگی! نجانے کون سے واقعات تھے جو ذہن میں ریوائنڈ ہونے لگے۔! اور ان کے چہرے پر پھر زردی اور سفیدی کا امتزاج ابھرنے

لگا۔ دل کی دھڑکن پھر پریشان کرنے لگی۔ اعافیہ کی مظلوم و مجبور شخصیت کی یاد آئی۔ اور انہیں یوں لگا جیسے ان پر دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ انہوں نے صوفہ پر نیم دراز ہو کر یوفوم کے نرم و گرم کشن پر سر رکھ دیا۔ اور یکبار گی تھرا گئے ابھی پچھلی ہی رات کو شب معراج کا واقعہ معہ اس سے متعلقہ عبادت کے ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ تھوڑا سا پروگرام ان کے کان میں بھی پڑ گیا تھا۔

"جو لوگ خدا کو بھول چکے ہیں۔ دنیا نے انہیں اپنی طرف کشش کر لیا ہے وہ لہو و لعب ہی کی زندگی کو اصلی زندگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور حیات بعد الممات ان کے لیے محض افسانہ ہے۔ وہ لوگ جان لیں یہ دنیا دارالغرور ہے۔ متاعُ القلیل، چند روز میں ختم ہو جانے والی۔ اور پھر ہر آدمی کو خدا کی طرف رجوع کرنا ہے۔ یاد کرو۔ وہ وقت جب تم مٹی پر لیٹے ہو گے۔ حشرات الارض تمہارے نازو نعم سے پالے ہوئے جسم سے اپنی غذا حاصل کر رہے ہوں گے۔ اس وقت تم میں اتنی طاقت بھی نہ ہو گی کہ تم ایک کیڑے کو بھی اپنے جسم سے الگ کر سکو۔ تو اے مسلمان بھائیو! عبرت پکڑو اس وقت سے۔ توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا۔ وہ تم سے مایوس نہیں جو تمہاری تخلیق کا باعث ہے۔ توبہ کرو۔ اور آئندہ کے لیے محتاط رہو۔ کچھ توشۂ آخرت بھی تیار رکھو۔ ذرا تو سوچو۔ تم ایک معمولی سفر پر روانہ ہوتے ہو تو پورے ساز و سامان کے ساتھ۔ اور تمہیں ایک دن کروڑے کوسوں کا سفر درپیش ہو گا۔ اس کے لیے تم نے کیا سامان تیار کیا ہے؟ وہ سفر جہاں کوئی تمہارا رفیق و مددگار نہ ہو گا بجز اللہ کے۔ اور تم اس دارِ فانی میں وہ کام کر رہے ہو جو سراسر خدا کی ناخوشی کا باعث ہے۔ تب تم اللہ کے رحم و کرم اور بخشش کے

مستحق کیوں کر ہو سکو گے۔؟"

اور میرے اعمال ۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے جھلک آئے۔ دل کی تیز دھڑکن کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے دبا لیا۔! آنکھیں اس طرح بند کر لیں۔ گویا خدا کی قہرناک نظروں سے بچنا چاہتے ہوں۔ مگر وہ نظریں آتشیں تیروں کی طرح ان کی بند پلکوں سے گزر کر ان کے دل کی رگوں کو چھید ے ڈال رہی ہوں!۔

"میرے اللہ۔ رحم کر۔ رحم کر۔!"

وہ بے ساختہ بڑبڑا اٹھے!۔ اور بے ساختہ ہی کراہنے لگے۔!

دانش کا مرجھایا ہوا چہرہ۔ ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ ساتھ ہی عافیہ کی یاد نے رگ رگ کا لہو نچوڑنا شروع کیا۔!

سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا۔ ہُنھ۔! وارث کی پیدائش۔ اگر عافیہ کو پتہ چل جائے کہ وہ وارث کی پیدائش کا ذریعہ بنائی گئی ہے تو شاید وہ ان کے جسم پر پھٹکار بھیج کر چلی جائے!۔ وارث ۔ ایک شکست خوردہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھری۔

وارث؟۔ اس پر دونوں جہان کی لعنت۔ کیا اب اس کا امکان ہے اس عمر میں ۔!

انہوں نے وحشت زدہ ہو کر اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ میں نے کسی کے سامنے رکھا ہوا کھانا چھین لیا ہے۔ کسی کا حق مارا ہے۔ کسی کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔! اور میں بھول گیا ہوں۔ اس وقت کو۔ جب ڈھائی گز کی تنگ و تاریک سرد کوٹھری میرا ابدی مسکن بنے گی۔ تب کوئی یار و مددگار نہ ہو گا۔ بُرے اعمال، حشرات الارض بن کے میرا جسم

جاتیں گے جیسے ناجائز کمائی کے استعمال سے میں نے خوب فربہ کرلیا ہے۔!

اوہ خدا۔ میں لوٹا دوں گا حق دار کو اس کا حق۔!

وہ یکایک پاگل ہونے لگے۔ کبھی اٹھے کبھی بیٹھے۔ اور کبھی ٹہلنے لگے

یوں لگتا تھا جیسے ان کے لیے یوم الحساب آپہونچا ہو۔ اور دُور دُور تک

کوئی ایسا محاسب نہ ملتا ہو جو اُن کے بجائے خود حساب دے سکے۔ اُلٹا

سیدھا جھوٹا مہمل۔!

دانش نے ان کی کتاب حیات کا وہ سیاہ ورق یکایک الٹ دیا تھا

اور آگے کے سادہ اوراق ان کے سامنے کھول دیئے تھے کہ وہ آئندہ ان پر

اپنا صاف، سیدھا اور سچا حساب لکھ سکیں!۔

وہ میز کرسی پر آبیٹھے اور مرتعش انگلیوں میں قلم تھام کرنئے سرے سے

اپنی وصیّت لکھنے لگے !!۔

فاخرہ حالات سے بد دل اور بدظن نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ ان

لوگوں میں سے تھی جو کبھی کسی حال میں بھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔

برائیوں پر برائیاں کرتے ہیں انھیں خوبیوں کا روپ دے کر خود کو بہلاتے

ہیں اور پھر برائیوں کے انبار تلے دفن ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں تو معاملہ

تھا۔ باپ کی کثیر دولت کا۔ رقابت کا۔ اپنا اور اپنی بچی کے وسیع مستقبل

کا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بڈھا باپ سارا سرمایہ اپنی دوسری بیوی کو سونپ

جائے۔ کیوں کہ اب اسے تو کچھ بھی ملنے والا نہ تھا۔ اسے مل چکا تھا جو کچھ

ملنا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے اسے دیدیا تھا اس کی قسمت کا حصہ۔ اور پھر الٹ کر اس کا حساب نہ پوچھا تھا۔ وہ اپنے باپ کے گھر میں ایک ناپسندیدہ فرد اور ناخواندہ مہمان کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ باپ کو اس کی مطلق فکر نہ تھی۔ رہتی ہے تو رہے۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ تک نہ ہوتے۔ نہ آج تک انہوں نے اپنی نواسی کی شکل ہی دیکھی تھی۔ اسے فاخرہ کی اولاد نہیں بلکہ اپنے دشمن کا خون سمجھتے تھے۔ وہ تو اسی بات پر سخت ناراض تھے کہ فاخرہ نے ان کے جانی دشمن کی بہو کہلانا گوارہ کیا تھا۔ ان کے دشمن کو خوش کر دیا تھا۔ اور یہ نہیں سوچا کہ اس طرح وہ اپنے باپ کی توہین و اہانت کا باعث بن رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب اسی لیے تو ناخوش تھے۔ اپنی شکل دکھانا اور اس کی شکل دیکھنا پسند نہ کرتے۔ اگر کبھی فاخرہ کی بچی روتی چلاتی تو بیرسٹر صاحب کا ملازم حکم لے کر پہونچ جاتا۔

"سرکار فرمارہے ہیں۔ اسے چپ کرائیے۔ ان کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"
اور تب فاخرہ خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔

وہ اس ماحول کی پروردہ تھی۔ جہاں اخلاق، مروت، پاسداری اور خلوص و محبت کے جذبے بے معنی تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ بیرسٹر صاحب نے اس کی ماں کو بھی اپنی سرد مہری اور بے رخی کا ہدف بنا رکھا تھا۔ انہیں ہمیشہ بانجھ درخت، بیکار شے اور نجانے کیا کیا کہہ کے ان کی دل آزادی کرتے رہتے تھے۔ انھیں اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ اپنی کمزوریوں اور نقائص سے فاخرہ واقف تھی اور ان کا ذمہ دار وہ بیرسٹر صاحب ہی کو ٹھہراتی تھی۔ وہ عمر بھر دولت کے پیڑ کی آبیاری کرتے رہے۔ سونے چاندی ہیرے موتی کے پھل پھول اکٹھا کرتے رہے۔ انسان اور انسانیت کی قدر

نہ کی۔ رشتوں کی پاسداری نہ کی۔ بیوی بچے کی محبت نہ پہچانی اور نہ انہیں اپنا التفات اور وقت دیا۔ تو پھر جب کہ زمانہ فاخرہ کا تھا وہ اس سے پورا پورا فائدہ کیوں نہ اٹھاتی۔ جیسے کو تیسا۔ ڈیڈی سے انتقام لینا ضروری تھا۔ اور انتقام کی بہترین صورت یہی تھی کہ ان کی دولت ہتھیا کر انہیں ضیق النفس میں مبتلا کیا جائے۔ انھیں اپنے ارادے میں کامیاب ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے۔! ایک غیر عورت کو فائدہ نہ پہونچایا جائے۔ اس کے ارادے بڑے بھی تھے اور برے بھی۔ اسے کسی ساتھی یا مددگار کی ضرورت تھی۔ اور وہ خوب سمجھتی تھی کہ راحیل سے بہتر مددگار ملنا مشکل تھا۔

وہ اس سے ناراض تو تھی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ قطعی قطع تعلق ہی کر لیتی۔ اسے راحیل کی سرشت معلوم تھی۔ اگر اسے سونے کی جھلک دکھائی جاتی تو وہ ایک بار پھر بندۂ بے دام اور ہاتھ باندھا غلام بن سکتا تھا اگر باپ کی دولت کا عشر عشیر بھی راحیل کو ملتا اور اس کے توسط سے پوری دولت فاخرہ کو ملتی تو راحیل کا ہنگامی ساتھ کیا برا تھا۔ اور تب۔ تب شاید وہ مان لیتا کہ فائزہ اسی کی اولاد تھی۔!

تمام مسائل اور پلان پر اچھی طرح غور کر کے اس نے راحیل کو خط لکھ دیا۔ اور اب۔ جبکہ راحیل اس کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ کمرہ بند کئے بڑی رازداری سے اپنے پورے پروگرام اس کے سامنے رکھ چکی تھی۔!

راحیل فاخرہ سے قطعی بدظن تھا۔ اور اسے قبول کرنے پر بھی تیار نہ تھا کیوں کہ اس کے عشق کا جذبہ کب کا دل سے نکل گیا اور اس کی جگہ بیزاری نے لے لی تھی۔ لیکن فاخرہ نے اپنے والد صاحب کے کثیر سرمائے کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو بھی قلابازیاں سی کھلادیں۔ بہت پہلے اس نے فاخرہ

کی جائیداد کا کچھ حصہ اپنے باپ کو دیدیا تھا۔ اور کچھ بمبئی میں عیش پرستی کی نذر کر دیا تھا۔ فاخرہ سب جانتی بوجھتی تھی۔ اس نے اپنے بینک سے معلوم کرالیا تھا کہ اس کا چیک کیش ہو چکا تھا۔ لیکن راحیل نے صاف کہہ دیا کہ کسی اور نے اس کے سامان سے چیک اڑالیا تھا۔ اور پتہ نہیں خود فاخرہ ہی ادھر ادھر ڈال کے بھول گئی ہو کیونکہ سوساز و سامان کے وہ ایک مدّت تک مختلف ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤز میں رہتے پھرے تھے سامان کی چوکیداری تھوڑی کی تھی۔ کیا خبر کہ کسی ویٹر ہی کے دل میں کمرے کی تلاشی کا خیال آیا ہو۔ دستخط تو فاخرہ نے کر ہی دیے تھے۔ حالانکہ اس کی یہ دلیل قابلِ قبول نہ تھی۔ لیکن فاخرہ نے اس سے بحث نہ کی وہ کٹ حجتی کرنے لگتا۔ اڑن گھائیاں بتانے لگتا اور ہرگز اپنی غلطی نہ مانتا۔ اس کے علاوہ فائدہ بھی کیا تھا کہ گڑے مُردے اکھیڑے جائیں۔ فی الحال آگے کی راہ ہموار کرلی تھی۔ سو راحیل نے بھی اپنے چہرے سے بیزاری ظاہر نہ ہونے دی۔ بلکہ وہ تو دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگا کہ بجائے اس شعلہ مزاج لڑکی سے اور کیا کچھ نہ حاصل ہوگا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے سے کیا خرچ ہو رہا تھا!

اس نے آنکھیں پھاڑ کر فاخرہ کی باتیں سنیں۔ اور اس کے خاموش ہونے پر بولا:

"یہ میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے ڈیڈی نے دوسری شادی کرلی ہے۔"

"نہ مانو تم۔" فاخرہ جھلاگئی "میں تو دیکھ ہی چکی ہوں اسے۔ پتہ نہیں یتیم خانے سے کوئی لاوارث لڑکی ترس کھا کے اٹھالائے ہیں یا پھر یونہی بے نکاح کے اسے رکھ لیا ہے۔ کون پوچھتا۔ مگر اس کے واری صدقے

جاتے ہیں۔ جانے کیا کچھ اسے دے دیا ہے۔ میری ممی کے نیلم اور یاقوت جڑے کنگن، ایک بڑا سا ہار، اور ہیروں کی انگوٹھیاں۔ ہنھ۔ جنم نہ دیکھا بوریہ سپنے آئے کھاٹ، وہ مردار بھی سارا زیور لادے رہتی ہے۔! دیکھ دیکھ میری آنکھوں میں خون اترتا ہے۔"

"ہے کہاں وہ عورت۔ مجھے بھی دکھاؤ۔!" راحیل نے کہا۔

"آج کل جانے کہاں گئی ہے۔" فاخرہ بولی۔ "مگر آجائے گی۔ اس کی جدائی میں ہمارے ڈیڈی دیوانے ہوئے پھر رہے ہیں۔ رات میں نے دیکھا کہ اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اور پتہ ہے۔ تمھیں بتاؤں اس حرافہ نے ایسی کونسی بوٹی سنگھائی ہے کہ بڑے میاں بس اسی کے پہلو سے چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ کاروبار سارا بند ہے۔ اب نہ موکل ہیں نہ مقدمے انجانے سوچا کیا ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کہیں سارا روپیہ پیسہ اسی چڑیل کے حوالے کر کے خود اللہ والے نہ بن جائیں!۔ ہنھ! کل رات عشا کی نماز پڑھ رہے تھے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔!"

"تو پھر اب تم کیا چاہتی ہو۔؟"

"تم یہ بتاؤ کہ تمھارا روپیہ اگر کوئی ناحق میں ہتھیا لیتا تو تمہارے محسوسات کیا ہوتے۔؟"

"میں تو اُلّو کے پٹھے کو ترٹی پار کر دیتا!۔"

"یہی تو میں بھی چاہتی ہوں۔" فاخرہ نے آنکھیں چمکا کر کہا۔ "ڈیڈی کی پائی پائی کی حق دار میں ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ ان کی داشتہ میرے حق پر ڈاکہ ڈالے۔ سنو راحیل۔ ہم کو یہ کرنا ہے کہ جب تک وہ کم بخت یہاں آئے۔ ہم کوئی تدبیر کر کے ڈیڈی کو میٹھی نیند سلادیں۔!"

"اور خود پھانسی پر چڑھ جائیں۔!" راحیل ہنسنے لگا۔ بڑی زہریلی ہنسی تھی۔ "تم کسی بات کا انتقام مجھ سے لینا چاہتی ہو شاید۔!"

"نہیں راحیل۔ انتقام وغیرہ کیا۔" فاخرہ نے جواب دیا۔ "میاں بیوی میں ہر طرح کی کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ مجھے اس کا خیال نہیں ہے کہ ہمارے تعلقات بہتر نہیں رہے تھے۔ وہ پھر سے بہتر ہو سکتے ہیں۔ مگر میں یہ سوچتی ہوں کہ جب تک ہماری راہ میں یہ دو ہمالیہ ہیں۔ ہم کوئی راستہ عبور نہیں کر سکتے! تم ڈیڈی کو سنبھال لینے کا وعدہ کرو۔ میں اُس ڈائن کو خود دیکھ لونگی۔"

"تم گہری نہیں اتر رہی ہو فاخرہ۔" راحیل کچھ مذبذب ہو کر بولا۔ "تمہارے والد صاحب شہر کے مانے ہوئے قانون داں سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی اتنی زندگی قانونی تانے بانے بنتے گذری ہے۔ کیا انہوں نے اپنی منکوحہ کے مستقبل کا کوئی پختہ بندوبست نہ کر رکھا ہوگا۔ اگر وہ ان کی اتنی ہی منظورِ نظر ہے کہ وہ قیمتی زیورات جو انہوں نے تم کو دینے پسند نہ کئے اور اسے دے دیئے ہیں تو پھر ہم کیا جانیں کہ انہوں نے اس کے لیے کیا کیا کاغذات اور دستاویزات تیار کر رکھے ہیں۔ ہم اگر دھر لیے جائیں۔ تو پھر۔ یہاں کوئی قانونی دفعہ کی دُم بھی نہیں جانتا۔ شاید تم ان کی بیٹی ہونے کی بنا پر صاف چھوٹ جاؤ۔ مگر میری گردن میں تو پھانسی کا پھندا پڑ ہی جائے گا۔! اب تو ہمارے ڈیڈی نے بھی صاف الٹی میٹم دے دیا ہے کہ وہ اب مجھے بٹھا کر نہیں کھلا سکتے۔ یعنی کہ مجھ سے وہ بیزار ہیں۔ اب میری تائید یا حمایت نہ کریں گے۔ میں نے تم سے شادی کر لی تھی نا۔ ان کی بھتیجی کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ سارے خاندان میں شرمندہ ہوئے تھے۔ لہذا انتقاماً وہ مجھ سے دستبردار ہو گئے ہیں جب دیکھو عاق کرنے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں

کسی الجھیڑے میں پھنس گیا تو ڈیڈی دامے، درمے اور سخنے کسی طرح کی بھی مدد نہ کریں گے۔!۔"

"تمہارے اور بہن بھائی ہیں راحیل۔؟" فاخرہ نے پوچھا

"ہم کُل نو عدد بھائی بہن ہیں۔" نہایت بُرا سا منھ بنا کر راحیل نے کہا

"اور پھر بھی تم نہیں سوچتے کہ اگر تمہارے ڈیڈی نے بٹوارے میں تمہارا حصہ نہ دیا۔ تم کنگال ہو گئے تو پھر تمہاری گزر بسر کیسے ہوگی۔؟ کیا بھیک مانگو گے تم۔ میں ایک اچھی راہ سُجھا رہی ہوں وہ تمہیں سوجھ نہیں رہی۔ ارے تم ڈیڈی ویڈی کا آسرا ہی کیوں تکتے ہو۔ ننھے بچے تو ہو نہیں۔ سب اپنی ہمت پر کرو۔ تمہاری عمر کے لوگ کیا کیا خطرناک کام نہیں کر لیتے۔ پہاڑ کی چوٹیاں سر کر لیتے ہیں۔ سمندر کی تہہ کھنگال لیتے ہیں۔ محاذ جنگ پر سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔ اور تم فقط ایک بڑھے آدمی کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے۔ یہ کہو کہ تم صرف نام کے اور دکھاوے کے مرد ہو۔ تم میں ہمت ہی نہیں ہے۔ صرف منہ پر نام کی مونچھیں رکھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔! اصلی چیز مردانگی ہے۔ وہ تم میں نہیں ہے۔"

راحیل کا مونچھ دار چہرہ تمتما گیا۔ بولا۔ "اچھا تو کیا کروں میں؟ بتاؤ۔!"

"سنو۔" فاخرہ نے آواز نیچی کر لی۔ "میں بے خوابی کی مریض ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر سے لکھوا کے خواب آور گولیاں لا دو۔!"

فاخرہ کا طعنہ تیر کی طرح راحیل کے حواسوں میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا: "لیکن ان کا استعمال۔ وہ خواہ مخواہ گولیاں کیوں کھانے لگے؟ وہ تو نہیں ہیں بے خوابی کے مریض۔!"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ آخر ان کی خدمت مجھ پر فرض ہے کہ نہیں۔" وہ بولی۔

سفاک انداز میں مسکرائی۔ "صبح سویرے ان کے دودھ، چائے اور کافی میں ملا دوں گی۔ کیا رفتہ رفتہ ان کا اثر نہ ہو گا۔؟"

"کام تیزی کا نہیں صبر آزما ہے۔ بہرحال میں شیشی لا دوں گا۔!" راحیل نے کہا پھر بولا۔ "اور بھئی۔ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ کوئی مہم جو اگر ایورسٹ پر پہنچ گیا تو اسے کیا ملے گا۔؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ کوئی تم اور میں علیحدہ علیحدہ ہیں۔"

"وعدہ بھول نہ جانا۔ ورنہ۔ پھر یہ ہو گا کہ ـــ" اور وہ دھمکی آمیز انداز میں چپ ہو گیا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ راحیل۔ تمہیں ابھی تک میری محبت کا اندازہ نہیں ہوا۔ میں نے گھر بار چھوڑا۔ باپ کی بات نہ مانی۔ مرتی ہوئی ماں کو اپنی شکل نہ دکھائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عزت کی بھینٹ چڑھائی تم پر۔ تمہیں کسی بات کا احساس نہیں۔ میری کسی قربانی کسی ایثار کو نہیں مانا تم نے۔ ہمیشہ چھیڑ چھیڑ کر جھگڑا نکالا اور خود کو اور مجھے اس درجہ پر پہنچا کے دم لیا۔ اب بھی چول چال یہ وہ اور ایسا اور ویسا کے اڑنگے لگا رہے ہو۔ آخر تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ دودھ پیتی بچی ہوں یا عقل سے کوری ہوں۔؟"

راحیل سوچ رہا تھا۔ جیب خالی ہے۔ باپ نے سنجیدگی سے منہ موڑا تھا حال تھی ہی نہیں۔ اسے دنیا سے گئے دس سال ہو رہے تھے۔ گھر کا سارا کارخانہ باپ نے اپنی سب سے بڑی لڑکی اور داماد کے حوالے کر رکھا تھا۔ بڑی بہن راحیل کے چال چلن کی بنا پر اس سے بیزار تھیں اور صلاح الدین صاحب نے سختی سے بیٹی داماد کو تاکید کر رکھی تھی کہ راحیل کو ایک جھنجھی کوڑی نہ دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ اسی طرح سیدھا ہو سکے۔ لیکن وہ

سیدھا کیا ہوتا۔ مزید ٹیڑھا ہو گیا۔!

دفعتہً فاخرہ نے اسے جھنجھوڑا۔ "وہ دیکھو۔ ڈیڈی جا رہے ہیں۔"

راحیل چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ فاخرہ نے آگے بڑھ کر پردہ میں ذرا سی دراز کر دی۔

"کیا دکھانا چاہتی ہو۔؟"

"کتنے کمزور اور اپ سٹ لگ رہے ہیں۔!"

"ہاں۔" راحیل نے سرگوشی کی۔ "زیادہ دن چلنے والے نہیں معلوم ہوتے۔ یہ اچانک اتنے کمزور اور لاغر کیسے ہو گئے؟ ایسے دلیر پیکر تھے۔؟"

"نوجوان بیوی کی جدائی۔!"

"اچھا۔ اچھا۔"

بیرسٹر صاحب صحن کے موڑ پر پہنچ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے یہ دونوں پھر اپنی جگہ آ بیٹھے! فاخرہ نے دلار سے کہا۔

"کھانا کھاؤ گے۔ لاؤں؟"

"نہیں بھئی۔ اب میں چلتا ہوں۔!"

"راحیل۔؟"

"ہوں۔!"

"پلیز۔ یقین کرو۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ فائزہ تمہاری بچی ہے۔ مجھے تمنا ہے کہ کبھی تو تم اس پر پیار بھری نظریں ڈالو۔ اسے پیار کرو۔ دیکھو راحیل۔ دیکھو اس کے فیچرز۔ کیا تم سے ملتے جلتے نہیں ہیں؟" فاخرہ اپنی رعونت و نخوت بھول کر گڑگڑائی۔

راحیل ہنسنے لگا۔ "تم اسے میری ہی منوانے پر کیوں مصر ہو ڈارلنگ

خیر، چلو، تم اگر چاہتی ہو کہ میں اسے اپنی مانوں تو یہی سہی۔ لاؤ اسے رکھ دو میری بانہوں پر۔"

اس رات فاخرہ اپنے باپ کے پاس خود دودھ لے کر گئی۔ اس نے نہایت حیرت سے دیکھا کہ وہ ایک طرف گوشہ میں جا نماز بچھائے عشا کی نماز پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ انہیں فاخرہ کی آمد کی بھی خبر نہ لگی۔ وہ سلام پھیر چکے تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دئے اور سسکتے دعائیں مانگنے لگے۔ فاخرہ نے ان کی بھاری سسکیاں سنیں۔!

"میرے پروردگار! معاف فرما مجھے۔ گناہ گار ہوں۔ سیاہ کار ہوں مگر تیری بے پایاں محبت سے مایوس نہیں۔ مجھے معاف کر دے۔ مولیٰ معاف کر دے۔"

اور پھر انہوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

فاخرہ نے نہایت برا سا منہ بنا رکھا تھا۔ ڈھونگ۔ نجانے اپنے کردار کے اس رُخ سے کسی کو کیا باور کرانا چاہتے ہیں۔! پھر بیرسٹر صاحب نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو فاخرہ بولی:

"ڈیڈی۔ دودھ لائی ہوں۔"

انہوں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ سرد آواز میں بولے:

"کیوں ناظمہ کہاں ہے؟۔ وہ کیا کر رہی ہے؟"

"میں نے خود اسے منع کر دیا ڈیڈی۔" فاخرہ نے بے حد شرمسار سعادت مندی سے کہا۔ "ملازم آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور میں محروم ہوں۔ میں گھر میں رہتی ہوں تو کیوں نہ آپ کے کام کروں؟"

"اچھا۔ رکھ دو۔ پی لوں گا!"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ڈیڈی ۔!"

"ٹھیک ہے!"

فاخرہ کب تک کھڑی رہتی۔ پھر چور کا دل کتنا ۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر چلی گئی ۔ اس نے بڑی تیز گولیاں پیس کر دودھ میں ملادی تھیں۔ بیرسٹر صاحب آخر بیرسٹر تھے انہوں نے دودھ چکھا۔ اور اس میں نمک کا سا مزہ محسوس کر کے پورا گلاس واش بیسن میں الٹ دیا۔ اور لائٹ بجھا کر مسہری پر آلیٹے۔

راحیل کی آمد ان سے پوشیدہ نہ تھی۔ ان کے ملازم نے خبر دی تھی کہ فاخرہ سے ملنے کے لیے راحیل صاحب تشریف لائے ہیں۔ بیرسٹر صاحب خوش ہوئے کہ ٹھیک ہے اب دونوں نے اپنی اپنی غلطیاں محسوس کر لی ہیں۔ شاید راحیل فاخرہ کو اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ بہر حال باپ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بیٹی کا گھر برباد ہو۔ وہ تو اس پر بھی تیار تھے کہ اگر فاخرہ وسائیت اور تمیز سے کچھ مدد طلب کرے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ لیکن فاخرہ نے مدد نہ مانگی ۔ راحیل اسے نہیں لے گیا۔ فاخرہ ان کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے لگی تب ان کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسے کتنے مقدمے لڑے تھے۔ جن میں محض حصول زر کے لیے بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ وہ اپنے خون کو پہچانتے تھے ۔ اور مشکوک رہتے تھے ۔! انہوں نے فاخرہ سے کچھ بھی نہیں کہا لیکن اپنی حد تک خبردار اور چوکنّا ہو گئے ۔!!!

عافیہ بے سان وگمان اپنے ماموں کے گھر جا اتری تھی۔ لیکن اس کا استقبال گرمجوشی سے نہیں ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی اجنبی بے کہے سنے کسی کے گھر میں گھس آیا ہو۔ شاید بیگم کریمی نے اپنی تمام داستان اپنے بھائیوں اور چھوٹی بہن کو سنادی تھی۔! وہ لوگ نہایت ہمدردانہ انداز میں عافیہ کو دیکھتے رہے تھے۔!

عافیہ ماں سے لپٹ گئی اور سسکنے لگی۔! انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا اور خود بھی رو پڑی تھیں۔!

یہ عجیب بات ہے۔ عورت پر چاہے کوئی بے جا ستم ہوا ہو۔ کسی نے اسکی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کا کوئی قصور بھی نہ ہو تب بھی نادانستہ طور پر زمانہ عورت ہی کو معتوب و خطاکار سمجھتا ہے۔! عافیہ مظلوم تھی۔! تباہیوں اور مظالم کا شکار تھی۔! لیکن پھر بھی وہ معائرانہ نگاہوں کا مرکز تھی۔ جیسے خون کے رشتوں کے درمیان پہونچ کر بھی اس کا کسی سے کوئی لگاؤ اور رشتہ نہ رہ گیا تھا۔! حالاں کہ ان سب کے دلوں میں اس کی محبت تھی اس کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔ لیکن شاید وہ سب غیر شعوری طور پر خود شرمندہ تھے۔! اور عافیہ سے اس لیے جھجک رہے تھے کہ وہ ایک بڑے سانحے سے دوچار ہو چکی تھی۔ اور غیر شعوری ہی طور پر وہ شرمناک سیچوئشن سب کے ذہنوں میں اپنی تمام شدتوں کے ساتھ زندہ تھی۔!

بڑے ماموں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور بولے: "تم نے اکیلے اتنا طویل سفر کر لیا بیٹی۔؟ کسی کو ساتھ نہیں لیا تم نے۔؟"

آنسو بہانے کے بعد عافیہ کچھ سنبھل گئی تھی۔! "جی ہاں۔! وہ تو کہہ رہے تھے کہ پرانی ملازمہ کو ساتھ لے جاؤ۔ مگر میں نے پسند نہ کیا۔ آپ سب سے جی بھر کے باتیں کرنے آئی ہوں۔ کیا اچھا لگتا کہ وہاں کی خادمہ یہاں بھی میرے سر پر سوار رہتی۔ ناپ تول کر باتیں کرنی پڑتیں۔ ڈر لگا رہتا کہ وہ سن تو نہیں رہی۔!"

چھوٹے ماموں اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھر رہے تھے۔ بولے "خیرالنسا تمہیں اتنی بھی کیا جلدی تھی۔ اس بے چاری کو تم نے کون سے جہنم میں ڈھکیل دیا ہے۔ صورت دیکھ رہی ہو تم اس کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ بھر کے فاقوں سے ہے۔ اور نجانے کتنی مار کھا کے آئی ہے۔ میں تو اس کی پہلے والی شکل بھی بھول گیا ہوں۔!"

بیگم کریمی نے کراہتے ہوئے کہا: "یہ اُن جنت نصیب ہی کے پیروں تلے انگارے بچھ گئے تھے بھیا۔ کسی کی ایک نہ سنی۔ غیروں نے اسے بے قصور سمجھ لیا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ چار لوگوں کو صورت دکھانے کا خیال ایسا تھا کہ بس اپنی عمر سے زیادہ بڈھے کے گلے ڈال کے ہی دم لیا۔ اب کیا ہونا ہے۔ فاقے کرے چاہے مار کھائے۔ نصیب اس مرادوں بیٹی کا دم میں بندھا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اللہ اسے اٹھا ہی لیتا۔"

"اللہ اگر مجبور ہے مجھے اٹھانے سے تو میں خود تو اٹھ ہی سکتی ہوں۔" عافیہ ماں سے رحم و محبت کی طالب تھی۔ انہیں اس قسم کی باتیں کرتے دیکھ کر اسے غصہ آگیا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ وہ ہر طرح معصوم اور پاک تھی۔ آخر یہ قدامت پسند بڈھے لوگ اپنے شرمناک خیال پر کیوں اڑے ہوئے ہیں۔ کیوں نہیں مان لیتے کہ وہ بھی سچ بول رہی ہے۔ اس نے نہایت سرد اور بے رحم لہجہ میں

کہا۔ "آپ لوگ میری موت چاہتے ہیں نا۔ تو میں آپ سب کی آرزو پوری کردوں گی۔ سچ ہے۔ بے حیائی کی زندگی سے موت اچھی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ میرے اپنے لوگ اس طرح میرے زخموں پر نمک چھڑکیں گے تو میں وہاں سے ہرگز نہیں آتی۔ وہاں کیا بُری تھی۔" وہ سسکنے لگی۔ "جس کے گلے اباجان نے ڈالا ہے۔ انہوں نے اس طرح تو جی نہیں جلایا۔ وہ تو میری صورت دیکھتے رہتے ہیں۔ زندگی تو عذاب میں مبتلا کی تھی ان کی بیٹی نے۔ اٹھتے طعنہ، بیٹھتے فقرے۔ اس سے گھبرا کر یہاں آئی تھی۔ مگر یہاں تو ـــــ اب جی بات ہی بیں جاتی ہوں اور اب مجھ میں شمہ برابر بھی غیرت باقی ہے تو جیتے جی نہ اپنی صورت دکھاؤں گی نہ آپ سب کی دیکھوں گی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جیسے مدتوں کے چھالے اب پانی بن کر بہہ نکلے تھے۔

چھوٹی خالہ نے اسے گلے سے لگالیا۔ بولیں: "کچھ دیوانی ہوئی ہو۔ عافیہ بھلا کون چاہے گا کہ دور پار دشمن تمہارا رونگٹا بھی دُکھے۔ بی بی یہ تو تمہارے سر سے گزرنے والے حادثے ہیں۔ جنھوں نے کلیجے میں ناسور ڈال رکھے ہیں۔ بھلا کبھی ہمارے خاندان میں ایسا ہوا تھا کہ ایک جوان لڑکی ساری رات کہیں رہ گئی ہو۔ شرم و غیرت طرح طرح کی باتیں کہلواتی ہے۔ ورنہ کیا ہمیں معلوم نہیں ہے کہ تم اپنی ذات سے ایسی نہیں ہو۔ اب کسی کی بات کا بُرا مت ماننا اور کوئی قدم ایسا نہ اٹھانا کہ آخرت میں روسیاہ ہو۔ خودکشی کوئی اچھی بات ہے؟؟"

"چھوٹی خالہ میں سچ کہتی ہوں۔ کہ اگر خدانخواستہ کسی نے مجھے انگلی بھی چھوائی ہوتی تو میں خود کسی تالاب کنویں میں گر کر اپنا منھ چھپا لیتی۔ مگر جب میں ہر طرح پاک ہوں تو آخر میرے اپنے لوگ مجھے ایسا

کیوں سمجھتے۔ ابا جان نے بھی میری قسموں پر یقین نہ کیا۔ اور اب امی بھی انہی کی زبان میں بول رہی ہیں۔ تو پھر میں کیا کروں۔ مر نہ جاؤں۔؟"

"ڈالو اس منحوس قصے پر پتھر۔" بس، خالہ نے بات رفع دفع کی۔

"اب کوئی کچھ نہ کہے گا۔ تم نے یقین دلایا ہم نے یقین کر لیا۔ اب تم آئی ہو ہنسی خوشی رہو۔ بچوں میں دل بہلاؤ۔ اِدھر اُدھر کی سوچ کر خون نہ جلاؤ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک تنکا تک اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا۔ سب کچھ اللہ کی نظر میں ہے۔ وہ ایک دن انصاف کرے گا! تم کیا کھاؤ گی۔ بتا دو۔ میں پکا دوں۔ سچ تو ہے کہ صورت بالکل بدل کر رہ گئی ہے۔ کیا وہاں کھانے پینے کا آرام نہیں تھا۔؟"

"کچھ خالہ جان۔!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مگر میرا کچھ بھی جی نہیں چاہتا۔ کچھ کھانے پینے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ میرے لیے کوئی تکلیف مت کیجئے۔" اس کا دل بجھ گیا تھا۔ ماں اور ماموؤں کے پاس آنے اور سکون سے دن گزارنے کی ساری خوشیاں ملیا میٹ ہو چکی تھی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی۔ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ وہاں اپنی حکومت ہوتی ہے۔ لاکھ شوہر بوڑھا ہو۔ مفلس ہو۔ مگر اسی سے بیوی کا بھرم قائم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد میکے والے بھی غیر ہو جاتے ہیں۔ ان سے اپنائیت کی توقع بیکار ہوتی ہے۔ اسے یاد آیا۔ بیرسٹر صاحب کس طرح اس کی خوشنودی کے جویا رہتے تھے۔ کیسی رحم طلب نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کی طرف۔ وہ کھو سی گئی۔!

پھر کسی نے عافیہ سے یا اس کی غیبت میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا۔ درحقیقت وہ سب کچھ شرمندہ سے رہتے تھے۔ چونکہ عافیہ کا دل صاف

تھا۔ اور اسے کسی قسم کے غلط تجربہ کا شعور ہی نہ تھا لہٰذا وہ دل سے چاہتی تھی کہ جیسے پہلی پوزیشن اس کی تھی ویسی برقرار رہے۔ اگر وہ رات بھر گھر سے باہر رہی تھی۔ کسی نے کوئی بد معاشی کی تھی تو اس سے عافیہ کا کیا بگڑ رہا تھا۔ وہ بات کی ہولناکی سے قطعاً ناواقف تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کے الٹے سیدھے اندازوں اور بھیانک پیش بینیوں سے متنفر ہو چلی تھی۔ اب اسے "اپنا گھر" یاد آرہا تھا۔

اکیلے میں بیگم کریمی نے کرید کرید کر اس سے اس کے سارے حالات پوچھے تھے۔ وہ ماں تھیں۔ ان کے دل سے لگی تھی۔ اور انہیں حقیقتاً اس پوری تباہی کا بڑا قلق تھا۔!

"بیت الکریم میں کون آیا ہے بیٹی؟"

"میں کیا جانوں امی۔ آپ ہی نے تو اپنا قفل پھاٹک میں ڈال دیا تھا۔" وہ بولی۔

"کوئی کرایہ دار اس میں نہیں آیا؟"

"معلوم نہیں۔"

"آہ۔ وہ گھر ہی ہمیں راس نہ آیا۔ اب سچ تو یہ ہے کہ میں بھی یہاں آکر پچھتائی۔ حمزہ کی پڑھائی برباد ہو رہی ہے۔ ہم بے غیرتی سے نوالے حلق سے اتار رہے ہیں۔ بھائی لاکھ اپنے ہوں۔ بھاوجیں اپنی کہاں ہیں۔ میں تو ہر وقت دستر خوان سے بھوکی ہی اٹھ جاتی ہوں۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کو۔ منحوس گھر کی آس تمہارے ہمارے زیور، گھر کا سارا تانبا پیتل اور رکھا اٹھایا روپیہ لگا دیا۔ آج میرے پاس پانچ دس تولے سونا ہوتا تو وہی بیچ کے کچھ روپیہ بڑے بھیا کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔

یہ کہنے کو تو نہ ہوتا کہ مفت کا کھا رہی ہوں۔ پرسوں نرسوں حمزہ کی فیس بھی بڑے دو سو چھوٹے بھیا نے دی تھی۔ ایسی شرم آئی ہے مجھے کہ جیسے کسی نے ڈھکے چھپے گالی دے دی ہو۔ اللہ۔ ہم نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا۔ جس کی یہ ہولناک سزا ملی ہے۔ کہ زمین آسمان بدل گئے۔ تقدیریں پلٹ گئیں جو داب میں بھی نہ سوچا تھا وہ سامنے آیا۔"

"بہت زیادہ نیکیاں بھی گناہ بن جاتی ہیں۔" جل کر خاک ہو کر عافیہ بولی۔ "یہ سب پرانی باتیں چھوڑیئے امی۔ نیکی کی جزا، بدی کی سزا، اچھے برے اعمال کا ردِ عمل سب کچھ بکواس اور پیٹ بھرے مصنفوں کی کتابی باتیں ہیں۔ جب ایسے غیر متوقع اور نہ سوچے ہوئے واقعات سامنے آتے ہیں تو سب باتوں پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ میں نے بھی تو اپنی عمر میں کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ میں تو ہر محتاج اور مسکین کا ساتھ دیتی تھی۔ کبھی کسی بھوکے کو اپنے در سے نہیں ٹالا۔ کسی ضرورتمند کو جواب نہیں دیا۔ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کی۔ پھر یہ کیا ہوا کہ میری تمام خوشیاں کسی قبرستان میں سو گئیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی آرزو تک پوری نہ ہوئی۔ چھ سال کی عمر سے سجدوں میں سر جھکاتی اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر نجانے کیا کیا دعائیں مانگتی آرہی ہوں۔ ایک کی بھی تو لاج نہ رکھی اس خدا نے۔ جسے اپنے بندوں سے ماں سے ستّر گنا زیادہ محبت ہے۔ نجانے کیوں خدا نے ماں کی محبت کا اس طرح مذاق بنایا ہے وہ خدا جو اپنے مجبور بندوں کے محسوسات جذبات اور ان کی زندگیوں کے اس بے دردی سے کھیلتا ہے۔ اسے اپنا خدا کون کہے۔ اب کس امید پر اس کے سامنے آنچل پسارے؟۔ ہم سے اچھے تو وہ دہریئے اور ملحد ہیں۔ جو خدا کو نہیں مانتے۔ وہ اپنے حال پر مطمئن ہیں کہ اگر ان کا کوئی خدا نہیں ہے

تو وہ بھی کسی خدا کے نہیں۔"

"توبہ کرو بیٹی توبہ کرو۔ یہ تم کیا کفر بک رہی ہو۔" بیگم کریمی لرز کر بولیں "ایسا نہ ہو کہ اللہ کسی اور آزمائش میں جکڑ لے۔"

عافیہ ہنس پڑی۔ بڑی جھلسی ہوئی ہنسی تھی۔ "جکڑ لے۔ مرضی اس کی۔ اب کسی آزمائش اور امتحان سے جی نہیں ڈرتا۔!" پھر نجانے کیا سوچ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ "امی۔ میں نے کیا کیا نہ سوچا تھا۔ جن کا تصور کرنے سے اب دل جلتا ہے۔ ایک مرتبہ دانش صاحب کی ڈسپنسری میں بیرسٹر صاحب کو بیٹھے دیکھ کر ان سے بڑی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اللہ کو شاید میری یہ نفرت ناگوار ہوئی۔ اس نے یہ حالات پیدا کر دیئے کہ میں خود ایک قابلِ نفرت ہستی بن کر ان کی زندگی میں آ گئی۔ ان کے احسان لیے۔ ان کے سامنے سر جھکایا۔ کیوں ہو گیا ایسا؟۔ امی۔ کیوں ہو گیا ایسا؟"

مُردہ آواز میں بیگم کریمی نے کہا:

"خدا کے بھید خدا ہی جانے۔ مگر سچ کاش ایسا نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ بے چارہ دانش۔ وہ کڑے کوسوں کے سفر پہ چلا گیا۔ کوسوں دور بیٹھا ہے۔ اپنے خیالوں میں میرا غریب بچہ مگن ہو گا۔ اسے۔ اسے یہاں والی قیامت کا کیا اندازہ۔ کیا خبر۔ وہ جب خوش خوش وطن واپس آئے گا تو کتنا بڑا دھچکہ لگے گا اس کے دل پر۔ کاش!۔ ایسا ہو جائے کہ وہ وہیں شادی کر لے اور خوش رہے!۔ مگر اب۔ یہ سب کچھ تم نہ سوچو بیٹی۔ تم نے اپنے باپ کی زبان سے سنا نہیں۔ شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن، زندگی کا جوا جب تک کہ گلے میں ہے۔ اسے مرضی سے یا نامرضی سے آدمی کو جھیلنا تو ہے۔ پچھلی یادیں زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں چاہے وہ اچھی ہوں کہ بری۔

اب تمہاری قسمت کے ساتھی وہی ہیں۔ تمہارا کام ان سے محبت کرنا ہے بیٹی۔ اپنی خدمت سے ان کا دل جیت لو۔ انہیں خوش رکھو۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور خوشی ہے۔! وہ اتنے بڑے نہیں۔ جتنا ہم نے انھیں سمجھ رکھا تھا۔ انہوں نے ہم سے بے لوث محبت کی ۔ ہم سب ان سے بدظن رہتے تھے۔ مگر انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا۔ تمہارے باپ سے پرانی دوستی کے ناطے انہوں نے ہم پر کتنے احسان کئے۔ تمہارے باپ تو انہیں بھول ہی چکے تھے۔ اخیر تک کہتے رہے کہ انھیں بیرسٹر صاحب سے پرانی دوستی یاد ہی نہیں آتی۔ اب وہ خود آئے۔ ان کا اتنا ساتھ دیا۔ ساتھ روئے ساتھ ہنسے۔ ہمارا سارا دکھ بٹا لیا۔ کوئی ہم انھیں بلانے گئے تھے۔ تو بیٹی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ ہیں۔ ان کی قدر کرو۔ ان سے محبت کرو ان کی خدمت کرو۔ شاید اللہ نے اسی میں تمہاری کوئی بہتری رکھی ہو۔"

عافیہ خاموش ان کی نصیحت سنتی گئی۔ وہ ان کی باتوں کی معصومیت کی قائل تھی۔ اور دل میں ارادہ کر رہی تھی کہ ان کا کہا مانے گی۔!

پھر وہ اٹھی۔ اور اپنے سوٹ کیس سے نکال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی ماں کو تھما دی۔ اور چپکے سے بولی: "جب میں نے یہاں آنے کا ارادہ کیا تھا تو انھوں نے اخراجات کے لیے دیئے تھے۔ میرا کچھ خرچ ہی نہ ہوا۔ اب یہ پانچ ہزار روپے آپ رکھ لیجئے۔ بڑے ماموں کو اپنا اور حمزہ کا خرچ دے دیجئے۔ اور حمزہ کی تعلیم پر لگائیے۔ مفت میں آپ کسی سے شرمندہ کیوں ہوتی ہیں۔!"

بیگم کریمی کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ " مگر بیٹی یہ تو اُن کا پیسہ ہے۔ لیتے ہاتھ نہیں بڑھتا۔ کیا ساری عمر ان کی خیرات کھایا کروں گی ؟"

"انھیں کیا پتہ چلے گا۔ امی۔ کیا میں ان سے کہوں گی۔ انہوں نے میرے اخراجات کے لیے دیئے تھے۔ حساب تھوڑی پوچھیں گے۔!" یہ کہہ کر عافیہ نے وہ رقم ماں کو دے دی۔

پیسہ انسان کا سب سے مقوی ٹانک ہے۔ چنانچہ پانچ ہزار کی رقم بیگم کریمی کے ہاتھ میں آئی تو ذرا ان کے حواس درست ہوئے۔ انہوں نے حمزہ کی تعلیمی ضرورتیں پوری کیں۔ اور اپنے بچوں کا خرچ بھائی کو دیا۔ تب ان سب کا سلوک بھی بدل گیا۔ ماموں تو گویا بھانجوں کے بغیر پیٹ بھر کے کھاتے نہ تھے۔ حمزہ نے اپنے "بہنوئی" کے غیر معمولی تمول کا قصہ سب کو سنایا تھا۔! انہیں عافیہ سے خاصی آمدنی کی توقع ہوئی تھی!۔

لیکن عافیہ کا یہ حال تھا کہ طائرِ نو گرفتار، اس کا کام سوچنا اور رونا تھا!۔ میکے میں آنے کے بعد اس کے خیال اسے زبردستی ماضی میں کھینچ لے گئے۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ جیسے ذہن کے شیش محل پر سے بیرسٹر صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت کا پہرہ ہٹ چکا تھا اور ہر دروازے سے دانش کی یاد اس کی پوری شخصیت میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔! اس نے تو ان کے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کھائی تھیں پھر اب۔ یہ تین چار سال کی مدت بہرحال گزر جائے گی۔ دانش وطن واپس آئیں گے۔ انہیں علم ہو جائے گا کہ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی بے وفا اور عہد شکن نکلی۔ اس نے صرف دولت کی خاطر ایک ناپسندیدہ شخص کی بیوی بننا گوارہ کر لیا۔ کیا وہ ان کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ کیا اپنی تباہی کی داستان انھیں لکھ نہیں سکتی تھی۔ اگر اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا تو وہ مر تو سکتی تھی۔! اس نے بے حیائی کا طوق گلے میں ڈال کر زندہ رہنا

کیونکر گوارہ کر لیا تھا؟

اور تب۔ وہ دانش کو کون سی صورت دکھائے گی۔

ان کے طنز یہ کٹیلے جلے جھلسے سوالوں کے جواب میں کون سا استدلال پیش کرے گی۔

تب کیا کرے گی وہ۔

اور وہ گھبرا کر رونے لگتی۔

گوشہ نشینی اس کی تقدیر، گریہ و زاری اس کا مشغلہ بن کر رہ گئی تب گویا کہ چھوٹی خالہ نے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا۔ بیگم کریمی سے رازداری سے بولیں:

"اے بڑی آپا۔ تم تو جیسے آنکھوں پر پٹی باندھے اور کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی ہو۔ لڑکی کی حالت تمہیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔ کیا اسے یونہی بے دوا علاج کے بیمار ہونے کے لیے چھوڑے رکھو گی۔؟"

"خدا نہ کرے بیوی۔ یہ وہم تمہیں کیوں ہوا۔ وہ بھلا کیا بیمار ہے۔" بیگم کریمی کسی نئے شاخسانے سے خوفزدہ ہو گئیں۔

چھوٹی خالہ مسکرائیں۔ "تم نہیں سمجھیں میرا مطلب۔ آپا۔ ارے اللہ رکھے تم چار بچے پیدا کر چکی ہو اور پھر بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ اس کی یہ گری گری حالت کیوں ہے۔ کھانا کیوں چھوڑ رکھا ہے اس نے۔ اسے آمادہ کرو تو کل ہی لیڈی ڈاکٹر سے تصدیق کروالیں۔"

ایک تاریک سایہ سا بیگم کریمی کے چہرے پر چھا گیا۔ پژمردہ آواز میں بولیں۔ "پہلے اس سے پوچھ تو لو کون سا مہینہ ہے۔ نوج شادی ہوئے دیر نہیں کہ یہ نگوڑے بچے۔ ابھی اس بد نصیب کی خود عمر کیا ہے۔"

پھر بیگم کریمی یوں چپ ہوئیں جیسے کسی غیبی قوت نے ان کی گویائی پر مہر لگادی ہو۔ یہ حقیقت تھی کہ انہیں بھی کریمی صاحب کی طرح عافیہ کی پاکی اور طہارت پر یقین نہ تھا۔ وہ عافیہ کی ہر تادیل کو اس کی ناتجربہ کاری پر محمول کرتی تھیں۔ وہ تو بیہوش کردی گئی تھی۔ کیا مطلب تھا بے ہوشی کا۔ بدمعاشوں کو خوف تھا کہ وہ چیخے گی، چلائے گی، شور مچائے گی۔ اس لیے انھوں نے اسے بیہوشی کی دوا کھلادی تھی۔ تو پھر۔ اب۔ یہ منحوس چیز جو عافیہ کے بطن میں ہے کس کا عطیہ ہے؟۔

ایک عجیب سی تھرتھری ان کے بڈھے جسم میں پڑگئی۔ انہیں اپنی معصوم بچی عجیب سی ستم رسیدہ اور بدنصیب معلوم ہوئی۔ تب ان کے دل سے دعا نکلی۔ اس شرمناک کلنک کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی عافیہ کا پردہ خدا ڈھک لے۔ وہ کچھ سنے بغیر بے آواز رونے لگیں!

اس رات جب وہ کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں سونے آئیں تو عافیہ کو ساتھ لائیں۔ وہ اب بھی بجھی بجھی سی تھی۔ چہرہ جیسے کسی تکلیف سے اترا ہوا۔ لبوں پر پیپڑیاں بندھی تھیں! آنکھوں کے نیچے حلقے پڑگئے تھے۔ ایک کرب ناک سانس لے کر بیگم کریمی نے دل میں سوچا۔ آثار تو سارے وہی ہیں۔

پھر انہوں نے کہا۔ "بیٹی۔ تیری طبیعت کچھ خراب ہے۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ تونے آج کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا۔ کیا بات ہے۔؟ اگر اللہ نہ کرے کوئی تکلیف ہے تو کل میرے ساتھ دواخانے چل۔ دکھوالائیں۔!"

"اندر سے طبیعت بیٹھی جاتی ہے امّی۔" بے سوچے سمجھے عافیہ نے کہا

پھر اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "یہ اُن یادیں ہیں۔ وہ بس سایوں کی طرح یہاں وہاں مجھے دن رات ڈستی رہتی ہیں۔ لاکھ چاہتی ہوں کہ اب دنیا میں جی لگاؤں جو ہوا وہ ہوا۔ گئی گزری باتوں پر میں کب تک سر دھنا کروں گی۔ مگر امی۔ میں اپنے دماغ پر قابو نہیں رکھتی۔ مجھے پچھلی یادوں کا سیلاب اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ اور میں پاگل ہونے لگتی ہوں۔!"

"بیٹی میں نے سمجھایا تھا کہ سب کچھ بھول جاؤ۔" انہوں نے کہا۔ "تم نے نئی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ اب اُسی ماحول میں تم کو کھپ جانا ہے میری بچی۔ آج اللہ رکھے تم بیوی ہو کل کو خدا نے چاہا تو ماں بنو گی۔ ایسے مایوس خیالوں کا اثر بچے پر ضرور پڑتا ہے۔ کیونکہ میں بھی تو دیکھ رہی ہوں کہ تم وہ پچھلی والی عافیہ رہی ہی نہیں ہو۔ تمہیں اپنے بچے کے لیے خوش رہنا ہے۔!"

"بچے کے لیے۔؟" حیرت سے عافیہ نے آنکھیں پھیلا دیں۔

"ہاں۔" بیگم کریمی نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "تم اگر پسند کرو تو کل میں تمہیں کسی لیڈی ڈاکٹر کے ہاں لے چلوں۔ وہ بھی تصدیق کر دے تو پھر چند مقوی دوائیں لکھوا لیں تمہارے لیے۔!"

ایک تلخ مسکراہٹ عافیہ کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "امی۔ یہ کس نے کہا آپ سے۔؟"

"میں جو تمھاری گری گری حالت دیکھ رہی ہوں!"

"کوئی بے شرمی کی بات آپ مجھ سے کہلوانا چاہتی ہیں امی۔؟"

"کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھی۔؟" وہ حیرت سے بولیں۔

عافیہ نے سر جھکا لیا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی بول دی۔ "شاید آپ کو

اب بھی میری بات کا یقین نہ آئے کہ۔ میں جیسی آپ کے گھر سے رخصت ہو کر
ان کے گھر گئی تھی۔ ویسی ہی اب بھی ہوں۔ !"
بیگم کریمی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ عافیہ بولی: "لوگ جانور پالتے ہیں
امی۔ انہیں ہر طرح آرام سے رکھتے ہیں۔ ان کے گلوں میں سونے کے پٹے
ڈالتے ہیں۔ مگر انہیں اپنا عزیز رشتے دار تو نہیں سمجھتے! آپ ایک سامنے
کی بات پر حیرت ظاہر کر رہی ہیں۔ !"
"نجانے بیٹی تقدیر تم کو کب تک نچائے رکھے گی۔ !"
"سو جائیے امی۔ آپ ان بے کار باتوں پر خون مت جلائیے۔ جب
تقدیر ہی کو بھگتنا ٹھہرا تو پھر صبر و سکون سے بھگتنا چاہیے۔ ہائے واویلا
کرنے سے قسمت نہیں بدلتی۔ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ !"
بیگم کریمی کا دل بھر آرہا تھا۔ کیسا ان کا گھرانہ برباد ہو گیا۔ شوہر ختم
ہوا بیٹی کا مقدر یہ ہے۔ حمزہ کا کوئی مستقبل نہیں۔ وہ خود بھائی کے گھر
پڑی۔ "داماد" کی خیرات پر گزارہ کر رہی ہیں۔ انہوں نے دیوار کی طرف
کروٹ لے لی۔ اور بے آواز رونے لگیں۔ پھر عافیہ بھی بستر پر لیٹنے جا رہی تھی
مگر حمزہ آگیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی! وہ بڑی حسرت سے اس سے اپنے
وطن حیدر آباد کی باتیں پوچھ رہا تھا۔ !
"تم اتنے مایوس کیوں ہو حمزہ۔ جیسے جلاوطن کر دیئے گئے ہو۔" عافیہ
کو اس کا لہجہ بڑا برا لگا۔ بے چارہ۔ یہ تو اس کے کھانے پینے اور صرف پڑھنے لکھنے
کے دن تھے۔ عافیہ کی بری تقدیر نے اپنی گردش میں اس کے سارے متعلقین
کو لپیٹ لیا تھا۔ اس نے بھائی کو تسلی دی۔ "تم اب میرے ساتھ چلو اور آرام
سے پڑھو لکھو۔ تمہیں کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہاری یہ اداس اور

مایوس شکل دیکھ دیکھ کر امی کا دل اور بیٹھ جائے گا۔! بے چاری کتنی کمزور اور بکھری ہوئی سی لگتی ہیں۔ یہ سفید چادرہ سی ساڑی میلا کُرتہ۔ ہاتھ ننگے۔ ہنسلی کی ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ حمزہ سوچو تا بھیا کہ تم لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر بھلا میں خاک سکون سے جی سکوں گی۔؟"

"آپا۔ ہماری فکر مت کرو۔!" حمزہ نے بجھے دل سے کہا۔ "میرا بی۔اے کا آخری سال ہے۔ میں اگر انشاءاللہ پاس ہوگیا تو کسی بھی جگہ نوکری کر لوں گا۔ اور امی کو ایک دفعہ پھر حیدر آباد لے جاؤں گا۔ وہ اتنی بدحواسی سے یہاں تو آگئی ہیں مگر ان کا جی نہیں لگ رہا ہے۔ بڑے ماموں اور مامون جان کا سلوک ان سے یونہی رواداری کا ہے۔ ممانیاں تو اعلانیہ ناگواری کا اظہار کرتی ہیں۔ مجھے ایک نوکر کی طرح ماموں جان کے چھوٹے صاحبزادے کو روزانہ صبح شام تفریح کرانے لے جانا پڑتا ہے۔ مجھے بیحد ناگوار ہوتا ہے مگر میں کچھ کہہ کے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ آپا۔ تمھارا رزلٹ نکلا۔ پاس ہوگئیں تم؟"

"ہاں۔ سکنڈ ڈویژن۔" بے دلی سے عانیہ بولی۔

"آگے نہیں پڑھو گی؟۔"

"آگے پڑھوں گی؟ ہُنھ! ارے میں نے تو رزلٹ ہی نہیں دیکھا۔ ایک صبح "انہوں" نے خوش خبری سنائی تھی!۔ بس۔ ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ پہلے کی بات اور تھی بھیا۔ اب ساری خوشیاں ارمان آرزوئیں مٹی ہوکر رہ گئیں۔"

"تم نے لکھا تھا آپا۔ کہ بیرسٹر صاحب کی صاحبزادی بھی۔ ان ہی کے پاس آکر رہ گئی ہیں۔ اور ان کا سلوک تم سے اچھا نہیں ہے۔!"

"جھڑبیری کی جھاڑی ہے بھیا۔ کوئی اس سے مطلب رکھے کہ نہ رکھے لپٹ پڑتی ہے۔ مجھ سے خدا واسطے کی دشمنی ہے۔ میری شکل پر نظر پڑی اور اس نے تھو مجھ پر رکھ رکھ کے اول فول بکنا شروع کر دیا۔ کلیجہ چھلنی کر دیا ہے اس نے۔ !"

"آہ آپا۔ تمہارا نصیب۔ کاش تمہاری شادی دانش بھائی سے ہوتی حمزہ نے ایک تیر بہن کے کلیجے کے پار کر دیا۔ "تمہیں ان کی یاد نہیں آتی۔؟ میں تو یہ سوچ کر اپنے آپ شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ جب وہ واپس آئیں گے انھیں ان تمام اکھاڑ پچھاڑ کا پتہ لگے گا تو وہ ہمیں کتنا کمینہ اور تمہیں کتنی بے وفا سمجھیں گے۔ ؟ سوچتی ہو کبھی آپا تم بھی۔؟"

وہ جانتے ہوں گے بھیا کہ جو کچھ پیشانی میں ہے وہ ایک دن پیش آنی ہی ہے۔ پھر گلہ کیسا اور شکوہ کس کا؟ میں تو خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ وہیں شادی کر لیں اور بھول جائیں مجھے۔ خدا کرے ساری زندگی میرا اور ان کا سامنا نہ ہو۔ بھیا سنو اگر کبھی عمر میں ایک مرتبہ بھی تمہارا ان سے ملنا ہو جائے تو میری قسم یہ سانحے جو ہم پر گزرے ہیں ان سے دہرانے مت بیٹھ جانا۔ اگر وہ میری بات پوچھیں تو کہہ دینا کہ عافیہ تو جانے کب کی مر چکی۔ ! یاد رکھنا اپنی قسم دی ہے میں نے تمھیں۔"

حمزہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"اب سو جاؤ حمزہ۔ نجانے کیا بجا ہے ؟ !" عافیہ نے کہا اور نیم وا دریچے سے باہر دیکھا۔ شفاف آسمان کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا جانے چاند کی کون سی تاریخ تھی کہ نکھری ہوئی چاندنی کی کرنیں ہر طرف مسکراتی بکھری ہوئی تھیں۔ تھوڑی سی چاندنی ان کے کمرے کی دیوار پر

بھی منجمد تھی۔ ایک ستارہ اکیلا اکیلا سا پلکیں جھپکا رہا تھا۔! دریچے کے نیچے جوہی اور گلاب کی کیاریاں تھیں۔ ان پر گزری ہوئی بہار نے اپنے آثار کی صورت میں تھوڑے سے پھول چھوڑ دیئے تھے۔ ان کی مہک ہواؤں کے دوش پر یہاں وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔ اور ایک نامعلوم سا ہیجان دلوں میں جگا رہی تھی۔!

حمزہ۔!" عافیہ نے اس کا متفکر اور اداس چہرہ غور سے دیکھ کر کہا۔

وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔!

"بھیا۔ تمہیں اپنے لیے کچھ خرچ کرنے کو چاہیے۔!؟"

وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ پھنسی پھنسی آواز میں بولا: "نہیں آپا سب ٹھیک ہے۔" پھر اس نے گڑبڑا کر کہا۔ "ابھی چھوٹے ماموں نے میرے امتحان کی فیس دی ہے۔ اور بڑے ماموں نے وعدہ کیا ہے کہ میرے کپڑے —!"

"سنو۔ اب تم کسی سے کچھ مت لینا۔ اچھا۔" عافیہ نے کہا اور اٹھ کر اپنے سوٹ کیس سے کچھ رقم نکال کر پھر حمزہ کے پاس آ بیٹھی۔ "مجھے بیرسٹر صاحب جو کچھ دیتے ہیں وہ میں یونہی ڈالے رکھتی ہوں۔ میرا خرچ ہی کچھ نہیں ہے۔" اس کی آواز حد درجہ تلخ ہو گئی۔ "مجھے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ سونا چاندی روپیہ پیسہ کپڑے لتّے۔ میری ایسی قسمت کوئی لڑکی لے تو آئے۔" وہ بے حد زہریلے انداز میں ہنسی۔ "تو مطلب یہ کہ یہ جو میرا جیب خرچ ہے۔ میرے کسی کام نہیں آتا۔ میں لے آئی ہوں اپنے ساتھ۔ یہ تین ہزار روپے ہیں۔ تم ان میں اپنے کپڑے سلواؤ۔ فیس دو۔ اور جو جی چاہے کھاؤ پیو۔ تمہاری بے آرامی کے دن تھوڑے ہیں بھیا۔ تم گریجویٹ ہو جاؤ گے۔ تمہیں کوئی کام مل جائے گا۔ تمہارے اچھے دن آجائیں گے۔

پھر تم امی کو حیدر آباد لے جاؤ اور اللہ کرے آرام و فراغت سے رہو...
کب ہے امتحان!؟"

"دو مہینے باقی ہیں۔!"

"خوب محنت کر لو اور پاس ہو جاؤ۔ اس کے بعد یہاں سے چلے جاؤ۔
امی کی صحت برباد ہو رہی ہے۔ یہاں ان کا جی نہیں لگ رہا ہے۔! ابا جان
کے بعد اب جو کچھ ہیں امی ہی ہیں۔ ان کی طرف سے لاپرواہی نہ برتو! سمجھے۔"

"آپا۔ مگر۔ مجھے شرم آتی ہے۔" حمزہ اس سے نظریں چرا کر بولا۔ "یہ
تو میرا فرض تھا کہ میں کماتا اور تمہیں دیتا۔ تم سے لیتے اچھا نہیں لگتا آپا۔
اور پھر یہ پیسہ تمہارا کہاں ہے۔؟"

"جب تم کمانے لگنا تو دے دینا مجھے بھی۔ اب یہ نہ سوچو۔ احسان
وحسان کچھ بھی نہیں۔!" یہ کہہ کر اس نے پورے نوٹ حمزہ کو تھما دیئے۔!

بیگم کریمی سب کچھ سن رہی تھیں۔ اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں دونوں
چپ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔! انہوں نے کہا؛ "بیٹی۔ تم نے مجھے پانچ
ہزار دیئے۔ حمزہ کو تین ہزار بخش دیئے۔! جہاں ہم نے بالواسطہ بیرسٹر صاحب
سے الفاروں لے لئے یہاں بلاواسطہ یہ بھی سہی۔ تو کیوں نہ ہم تمہارے ساتھ
حیدر آباد چلیں۔ ہم دو جانوں کا خرچ کیا ہے۔ میں اسی میں گزر بسر کر لوں گی
یہاں تو مجھے دق ہو جائے گی۔ ہم وہیں چھوٹا سا گھر کرایہ پر لے لیں گے۔
یہ دن رات کی کھٹک، الجھن اور بے چینی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی
ہے۔ ہائے کیا سوچ کر بھیا کا دریچہ اٹھا۔ دنیا کا خون سفید ہو گیا ہے۔
بھائی اپنی بدنصیب بیوہ بہن کو دو روٹی اور ایک جوڑے کپڑے سے بھی
مدد نہیں دے سکتے!"

"امی اگر ہم اب اس پرانے محلہ میں نہیں رہیں گے۔!" حمزہ نے کہا۔
"کیوں۔؟" عافیہ کے دل میں پھر پھانس سی چبھ گئی۔
"کیا فائدہ آپا۔ کہ پھر سے گڑے مُردے اکھڑے جائیں!"
"ہم موسی ندی میں جھونپڑی ڈال کے رہ لیں گے۔ مگر اب یہاں نہیں رہیں گے"
"پھر میری پڑھائی۔!" حمزہ نے کہا۔ پھر بولا۔ "خیر اس کی زیادہ پرواہ نہیں۔ اب تو تعلیم ہو بھی نہیں رہی ہے۔ اکنومکس کے لیکچرر صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ ان سے استدعا کروں گا کہ میرا ہال ٹکٹ مجھے بھجوا دیں۔ اور امتحان سے دو ایک روز قبل پھر یہیں آجاؤں گا۔ کسی ہوٹل میں رہ کے امتحان دے لوں گا۔ اور کیا چاہیے۔!"
"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے!۔" عافیہ بولی۔
چنانچہ دوسرے دن حمزہ اپنی ضروری کارروائیوں میں مصروف رہا جب اس کے حسب منشا کام بن گیا۔ تو تیسرے چوتھے روز عافیہ اپنی امی اور حمزہ کے ساتھ پھر حیدر آباد واپس آگئی۔

اس روز بیرسٹر صاحب کے حسب الحکم ان کے ملازم نے انہیں پھر اطلاع دی کہ راحیل صاحب تشریف لائے تھے اور صاحبزادی فاخرہ کے کمرۂ خاص میں محوِ گفتگو تھے۔ بیرسٹر صاحب کو راحیل کا روز روز کا آنا جانا پسند نہیں تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں فاخرہ سے گفتگو کی تھی

اپنی عادت کے موافق اس نے بڑی بدتمیزی سے جواب دیا تھا۔
"کیا بیٹی داماد باپ کے گھر رہنے نہیں آتے؟ راحیل توکب کے اپنی دشمنی بھول چکے مگر آپ کے دل سے وہ بات نہیں نکلی آپ نہیں چاہتے کہ میں سکھ سے رہوں۔ اگر یہاں راحیل آتے ہیں تو آپ کا کیا بگاڑتے ہیں؟"
"وہ تمہیں اپنے گھر لے کے جائیں۔ یہ کوئی ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔"
بیرسٹر صاحب کو بھی غصہ آ گیا۔ مگر فاخرہ نے ان کی نہ سنی اور برابر راحیل آتا رہا تھا۔
اس کی یہ پر اسرار سی آمد رفت، گھنٹوں میاں بیوی کی سرگوشیاں کسی ڈھکی چھپی سازش کا شاخسانہ معلوم ہوتی تھیں۔ لہٰذا اس دن جب کہ راحیل آیا اور کسی قسم کے سلام کلام کے بغیر سیدھا بیوی کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ تب بیرسٹر صاحب بھی ضبط نہ کر سکے۔ وہ پچھلے برآمدے سے ہوتے ہوئے اس طرف آئے جہاں کھڑے ہو کر اگر سنا جاتا تو کمرے کے اندر ہونے والی ساری باتیں باہر سنائی دیتی تھیں۔ اگر چیکہ ان کا ارادہ مجرمانہ نہیں تھا۔ لیکن وہ گفتگو ان ہی سے متعلق تھی اور اس قسم کی تھی کہ وہ اُدھر ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔! فاخرہ نہایت ملامت خیز لہجے میں کہہ رہی تھی:
"پتہ نہیں تم بچوں کو بہلانے والی گولیاں اٹھا لائے تھے یا مجھے پاگل بنایا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا ان سے۔ پوری شیشی خالی ہو چکی۔ مگر موت تو ایک طرف رہی۔ انہیں تو کسی وقت گہری نیند بھی نہ آئی۔!"
"ہاں۔" راحیل کی آواز آئی۔ وہ بھی فکر آمیز تھی۔ "دیکھ تو رہا ہوں میں بھی۔ بڑے میاں دندناتے پھر رہے ہیں۔ کچھ دبلے اور کمزور

تو بے شک معلوم ہو رہے ہیں۔ مگر کبھی ہمیشہ کے لیے لیٹ جائیں۔ ایسا نہیں لگتا!"

"اب خواب آور گولیوں سے کام نہیں چلے گا۔ راحیل۔" فاخرہ نے کہا۔ "کوئی ٹھوس قدم اٹھانا پڑے گا۔ بھلا ایک ایک گولی سے بھی کوئی مرا ہے۔؟"

"تو پھر کیا کروں۔ اب کوئی قاتل زہر تو نہ میرے پاس ہے نہ مجھے اس کا علم ہے کہ ایسا سم قاتل کہاں ملے گا؟" راحیل بولا۔ "کہو تو دس پانچ غنڈوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں ایک ہی وقت میں چین کی نیند سلا دوں۔ مگر مٹھی گرم کرنے کے لیے آگ تم ہی کو فراہم کرنی پڑے گی!۔"

"کچھ ہوش میں تو ہو۔" فاخرہ نے جواب دیا۔ "میں ہی باپ کو قتل کرواؤں اور میں ہی ان کے قاتلوں کو معاوضہ بھی دوں؟ ایسی تجویزیں پیش نہ کرو۔ کہ سچ مچ کام تو کچھ نہ بنے اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں پھندہ پڑ جائے۔!"

"آج کل میری عقل گم ہے۔ کیونکہ جیب میں بارہ بجے ہوئے ہیں!"

"ازل کے قلاّش ہو۔" فاخرہ کی آواز سنائی دی۔ "ابھی پرسوں ہی تو میں نے چھپا چھپا کر ایک ہزار دیئے تھے۔ اکیا وہ ختم کر دیئے۔ شراب وراب پینے لگے ہو کیا؟۔"

"غم غلط کرنے کا واحد موثر طریقہ۔ ڈارلنگ!۔"

"اب نہیں ہے میرے پاس کچھ بھی۔ سمجھے۔؟"

"تم نے کہا تھا کہ تمہاری نوجوان اور حسین سوتیلی والدہ صاحبہ اپنا سارا زیور یہیں رکھ گئی ہیں۔ اڑا لاؤ ایک آدھ ہار یا انگوٹھی تو ہم تم

ہفتہ بھر تک عیش کریں۔"

"نجانے بڑے میاں نے اپنی محبوبہ کی چیزیں کہاں چھپالی ہیں۔!
کل وہ باہر چلے تھے تو میں نے الماری کی تلاشی لی تھی، سونا تو ایک طرف رہا
مجھے تو چاندی کا چھلا تک نہ ملا۔"

اس کے بعد آوازیں آنی بند ہوگئیں!۔ نجانے سرگوشیوں میں کیا
پروگرام بننے لگے۔ بیرسٹر صاحب کے سمجھنے میں کیا دیر لگتی کہ یہ انہی کے بارے
میں کہا گیا تھا۔ ایک ناقابل برداشت غم کسی جان لیوا درد کی طرح ان کے
پورے جسم میں پھر گیا۔ انھیں کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔! اور آنکھوں تلے
اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ انہیں خدشہ ہوا کہ اگر وہ دیوار کا سہارا نہ لیں
گے تو گر ہی پڑیں گے۔!

بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں آئے۔ اور جلدی سے آگے بڑھ کر
دیوان پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ پھر ان کا دوران سر انہیں چکر گھنّی بنانے
لگا۔ جیسے وہ کسی مرتعش جھولے پر سوار ہوں۔ اور وہ جھولا کبھی آگے
پیچھے کبھی اوپر نیچے اور کبھی دائیں بائیں یوں جھکورے لے رہا ہو کہ سنبھلنے
نہ دیتا ہو۔! انہوں نے چاہا کہ کسی ملازم کو آواز دیں مگر ان کی حلق سے آواز
نہ نکل سکی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر کہنی ڈھانک لی اور لمبی لمبی سانسیں
لینے لگے۔! انہیں صدمہ تھا۔ بے حد صدمہ۔ ان کے جھولتے ہوئے دماغ
میں ماضی حال اور مستقبل کے عجیب عجیب خاکے بن رہے تھے۔ بگڑ رہے
تھے۔ جب فاخرہ پیدا ہوئی تھی تب ان کے دروازے پر ہفتہ بھر تک
شہنائی گونجتی رہی تھی۔ محتاجوں اور مسکینوں کو انہوں نے کپڑا اور
غلّہ بانٹا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے اس کی سالگرہ منائی جاتی تھی

جب وہ اپنی کلاسوں میں پاس ہوتی گئی تب کتنی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اس کی کوئی آرزو کوئی خواہش انہوں نے پوری کرنے کو اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کی جا و بے جا ہر ضد مانی تھی۔ اپنے بڑھے ہوئے دلار پیار میں اسے نہلا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ بیوی کی فہمائش پر وہ بیوی سے بگڑ جاتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ اسی بیٹی نے ان کے اُس جانی دشمن کے لڑکے سے شادی کر لی۔ ان کی مرضی کے بالکل خلاف اور وہ دشمن بھی ایسا کہ ان پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ اس بیٹی نے جاں بلب ماں کو بھی مُڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ بیچاری بیمار ستم رسیدہ ماں جو بیٹی کے ہر ہر قدم پر اللہ آمین کرتی تھی۔ !اس کے لیے دست بہ دعا رہتی تھی۔! اور پھر۔ یہی دلاری لاڈلی چہیتی اکلوتی بیٹی ہے جو باپ کے دشمن کے ساتھ مل کر باپ کے قتل کی سازشیں کر رہی ہے!!

پھر مستقبل نے بڑی ہولناک جھلک دکھائی۔

وہ ختم ہو چکے ہیں۔ عافیہ دھکّے دے دے کر گھر سے نکالی جا رہی ہے۔ اس کا کوئی حق اب رہا نہیں ہے۔ وہ اپنی بے بسی بے سروسامانی پر رو بھی نہیں سکتی۔ پھر وہ ادھر ادھر گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اس کا کوئی رہا نہیں ہے۔ باپ نہیں۔ بھائی نہیں۔ ماں نہیں اور شوہر بھی نہیں!! وہ اکیلی ہے۔ بے یار و مددگار،

راحیل اور فاخرہ خوش ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے وہ سرمایہ بٹور رہے ہیں۔ جس پر اب ان کا کوئی حق نہیں رہا ہے۔ باپ کے مرنے کا کوئی غم فاخرہ کو نہیں ہے۔

اور غم و اندوہ کا کیا سوال جب کہ وہ چاہتی یہی تھی۔

پھر بیرسٹر صاحب پر ایک جانکاہ اور نہایت تکلیف دہ حقیقت منکشف

ہوئی۔ فاخرہ انہیں کوئی سازہر دے رہی تھی ! زہر ——؟

تب ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ آخر فاخرہ ان کی خدمت پر کمربستہ کیوں ہوئی تھی ۔؟ وہ کہ جس نے کبھی خود سے پانی فرج سے نکال کر نہیں پیا تھا۔!

بیرسٹر صاحب کا دوران سر کم ہوا۔ کچھ آنکھیں کھلیں تو وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔!

"کیا ہوتا اگر میں دودھ پیتا رہتا۔ کافی اور چائے حلق سے اتارتا رہتا." انہوں نے سوچا۔ ویسے وہ فاخرہ کی دل شکنی کے خیال سے اس کا لایا ہوا دودھ اور کوئی انجمی مشروب پیتے نہیں تھے دکھاوے کو رکھ لیتے تھے بعد میں وہ سب کچھ نالی کی قسمت میں جاتا۔! انھیں عرصہ سے میٹھے مشروب پسند نہ رہے تھے۔ اب وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے کہ بن موت مرنے سے بچ گئے تھے۔!

لیکن انہیں کتنا شدید صدمہ تھا۔! وہ صدمہ جو رگ رگ سے روح کھینچ رہا ہے! کیسی عبرت ناک بات ہے۔ بیٹی داماد ان کی جان لینا چاہتے ہیں۔؟ کیا یہ قدرتی سزا ہے۔؟ خدا نے ان کے کانوں سے وہ سب کچھ سنوا دیا ہے جو اُن کے لیے سامانِ عبرت اور درسِ ندامت ہے۔ انہیں خداوند کریم نے ایک موقع عطا فرمایا ہے۔ آخری موقعہ۔ کسی فیصلے کے لیے؟

ان کے اعصاب جھنجھنانے لگے۔!

اور وہ پھر کسی پاتال میں اُتر گئے!

زندگی کے تمام اعمال باری باری اپنی جھلک دکھانے لگے۔!

ان کی پیشانی پسینے سے بھیگنے لگی۔!
چہرہ یرقان کے مریض کی طرح زرد ہو گیا۔!
آنکھوں تلے سیاہ حلقے واضح ہو گئے۔!

ہونٹ، دل سے ابھرنے والی گرم آہوں کے جھکڑ سے خشک ہو گئے اور ایک مرتبہ پھر رُوح کی گہرائیوں سے کوئی آواز اپنی بازگشت سنانے لگی۔

"سنو! اور یاد رکھو۔ تمہارا ایک ایک عمل چاہے وہ خیر ہو کہ شر، اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ تمہارا ایک ایک حصہ جسم اللہ کے سامنے تمہاری شکایت کرے گا۔ اب بھی وقت ہے۔ توبہ کر لو درِ توبہ بند نہیں ہوا۔ قبل اس کے کہ اجل تمہیں کوئی مہلت نہ دے۔ تم اللہ سے اپنے لیے رحم و بخشش کی بھیک مانگ لو۔
بے شک اللہ تعالیٰ دانا بینا اور غفورُ الرّحیم ہے۔"

ان کی دھندلی پُرنم نظریں الماری کے اوپر رحل پر رکھے کلام پاک پر پڑیں۔ نجانے کب سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا نہ تھا۔! جزدان پر گرد اور جالے تھے۔ یکبارگی وہ تھرّا اُٹھے۔
کیا ایک یوم الحساب انہیں پیش نہ آنا تھا۔؟
خدا نے انہیں خبردار کر رکھا تھا۔
"مال اور اولاد تمہارے لیے فتنہ ہیں۔"
کتنی سچی بات ہے۔ جو اُن کے سامنے حقیقت بن کر آچکی تھی۔!
اور بھی جتنی تاکیدیں، تنبیہہ اور نصیحتیں ہیں۔ عذاب و ثواب کے تذکرے ہیں وہ بھی ایک دن سامنے آنے ہی والے ہیں!۔

ڈپھر
ان کے سامنے ایک بڑی عظیم الشان عدالت کا نقشہ پھر گیا۔
دونوں جہان کا خالق جس کا جج ہوگا۔!
ہوشیار، منصفِ حقیقی کے آگے حاضر ہونے کا گجر بج چکا!
دفعتہً ان کے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اگل دیا۔ دل ایک مرتبہ بڑے زور سے دھڑکا۔ ہاتھوں اور پیروں سے جان کھنچنے لگی اور وہ صوفے سے لڑھک کر فرش پر گر پڑے۔ لڑکھڑاتی زبان سے صرف اتنا نکلا۔
"اللہ۔ اللہ۔"
نجانے آنکھ کب کھلی۔ مگر اپنے بستر پر کھلی۔ قبر میں نہیں۔ منکر نکیر کی بجائے سرہانے ڈاکٹر دانش اور اپنے سارے ملازمین نظر آئے۔!
ایک گہری سانس لے کر انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
دانش نے ان کی نبض تھام لی۔ اور بے حد ہمدردی اور نرمی سے پوچھا: "آپ کو کیا ہوا جناب عالی! کس قسم کی فکروں نے آپ کو اس نوبت پر پہونچا دیا ہے۔ جب یہ آپ کے ڈرائیور صاحب نہایت پریشانی کے عالم میں مجھے بلانے آئے تب تو میں بھی گھبرا گیا تھا جناب ... اب آپ خود کو کیسا محسوس کر رہے ہیں؟۔"
"میں خود بھی تو گھبرا گیا تھا صاحب۔!" ڈرائیور یہ سمجھ کر گڑگڑانے لگا کہ اس سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہے۔ "سرکار کو اس عالم میں دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اور میں دوڑ کر آپ کو بلا لایا۔"
"دانش میاں۔" بیرسٹر صاحب کے لب ہلے۔
"فرمایئے جناب۔" دانش نے کہا۔

"میاں مجھے کیا ہوا ہے ؟۔"
دانش کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔
"بولو میاں۔ تمہیں خدا کا واسطہ کہو۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ ؟"
دانش نے ہچکچا کر کہا۔ "دل کا دورہ۔ بیرسٹر صاحب۔"
"اتنی مہلت دے گا کہ میں کسی سے کچھ کہہ لوں۔ کسی سے کچھ سن لوں ؟"
"آپ کی بھی کیا باتیں ہیں جناب۔" دانش نے ان کو دلاسہ دیا۔ میں آپ کو اپنے ساتھ اسپتال لے چلوں گا اور ـــــ !!"
"امراض قلب پر تم نے بھی شاید تھوڑی سی ریسرچ کی ہے ؟۔" اب وہ کسی قدر ٹھیک لگ رہے تھے۔ انہوں نے پوری آنکھیں کھول کر دانش کو دیکھا۔ اور دانش کو شبہ ہوا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی !۔
"میں اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میرے محترم۔" دانش نے جواب دیا۔ "میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میں آپ کو اپنے ساتھ اچھے نرسنگ ہوم لے چلوں گا اور بڑے بہترین ماہر امراض قلب سے آپ کا چیک اپ اور مکمل علاج کرواؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو آپ ـــــ !"
"مجھے سچ سچ بتا دو۔ یہ جو دورہ مجھ پر پڑا ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے تمہیں خدا کی اور اس کے نیک بندوں کی قسم سچ سچ بتا دو !"
"ارے۔ آپ اس قدر پریشان ہو رہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ـ!"
بیرسٹر صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولے "بس تم میری بات کا جواب دو اور یہ مت سمجھو کہ میں گھبرا رہا ہوں۔!"
دانش نے سر جھکا لیا۔ "ہائپر ہارٹ اٹیک جناب۔ غیر معمولی فکروں اور ناقابل برداشت خیالوں کا نتیجہ۔ !"

"یا اللہ۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" تھک کر بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا اطمینان اور سکون چھا گیا تھا۔ "خدا نے مجھے حرام موت مرنے کے گناہ سے بچا لیا۔ اب وہ خود مجھے اپنے پاس بلائے گا۔"
دانش سمجھے شاید وہ شدتِ خوف و دہشت سے ہذیان بکنے لگے ہیں لہٰذا انہوں نے کہا:
"تو پھر آپ تیار رہیں۔ میں آپ کو ڈاکٹر مسٹر چودھری کے پرائیویٹ نرسنگ ہوم لے چلوں۔ وہ شہر کے سب سے بڑے اور مشہور ہارٹ اسپشلسٹ ہیں"
"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔!" بیرسٹر صاحب نے فوراً کہا۔ "میں کہیں جانا نہیں چاہتا۔ اگر میں پھر بے ہوش ہو جاؤں تو تب بھی مجھے مت لے جانا یہ میری تاکید ہے۔"
"لیکن۔ کیوں۔ کیا آپ مرض بڑھانا چاہتے ہیں۔" دانش متحیر تھے "معاف کیجئے۔ میں آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گا۔ میں آپ کو زبردستی لے جاؤں گا۔ آپ کی زندگی مجھے بہت عزیز ہے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کے انکار اور میری غفلت سے وہ ضائع ہو۔ اٹھیے جناب۔ ہمت کیجئے۔ اور ہمارے سہارے چلئے۔!"
اور تب بیرسٹر صاحب نے انہیں پھر دیکھا۔! کتنا اجڑا ہوا آدمی تھا۔ اپنے پچھلے وقار اور جاذبیت کے بالکل برعکس۔ چہرے پر مجہول اور کاہل آدمیوں کی سی بے مرمّت داڑھی۔ مونچھوں کی بدنمائی۔ گال اندر دھنسے ہوئے، لب خشک اور آنکھوں میں یاس و حسرت کی ایک برباد دنیا نا امیدیوں کے بگولوں میں لپٹی ہوئی۔
ایک جاں گسل کراہ بیرسٹر صاحب کے دل کی گہرائی سے نکلی اور لبوں

پر مر گئی۔

انہوں نے اس کے سامنے کھلے ہوئے خوش رنگ چمن کی بھرپور بہاروں میں آگ لگا دی تھی۔ اور وہ خود بھی تو شباب کی پر کیف ہواؤں میں کھلا ہوا ایک پھول تھا۔ جس پر صرف ان کی وجہ سے خزاں چھا گئی تھی۔!

اور پھر پچھتاووں نے ان کا لہو سکھانا شروع کر دیا۔

یہ بے خبر انسان — اور وہ مظلوم لڑکی —؛ میرے خدا۔

دانش نے کوئی سا عرق ننھے سے پیمانہ میں انڈیلا تھا اور بڑی دل سوزی سے بیرسٹر صاحب پر جھکے!

"لیجئے۔ یہ پی لیجئے۔ اگر آپ چلنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ میں ابھی تمام خدمات آپ کے لیے وقف کرتا ہوں۔ میں خود آپ کا علاج کروں گا۔!—"

"لاؤ مجھے دیدو۔!" بیرسٹر صاحب نے کہا اور پیمانہ دانش کے ہاتھ سے لے لیا۔ لیکن دوا پینے کی بجائے انہوں نے پیمانہ دور پھینک دیا۔

"یہ کیا۔؟" دانش اچھل پڑے۔ کہیں موت کے خوف نے ان کے حواس تو نہیں معطل کر دیئے! مگر بیرسٹر صاحب مسکرا رہے تھے۔

"بیٹے!۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے زندگی کی سزا کیوں دے رہے ہو۔"

"صاحب آپ نے یہ کیا کہا ہے۔" ملازم بھی بولے۔ بڑے خاموش۔ اور اداس سے سارا کارخانہ دیکھ رہے تھے۔ گھر کی پرانی بڑی بی الگ آبدیدہ سی کھڑی تھیں۔!

پھر دانش کے ساتھ ساتھ سب نے ہزار اصرار کیا خوشامد کی ہاتھ پاؤں جوڑے مگر بیرسٹر صاحب کا انکار، اقرار سے نہ بدلا۔ نہ تو انہوں نے کوئی دوا پی اور نہ انجکشن لینے پر راضی ہوئے۔!

دانش کو حیرت تھی کہ باپ کی یہ نوبت ہے۔ اور صاحب زادی اور داماد صاحب کہاں غائب ہیں۔ انہوں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تھوڑا بہت تو انھیں معلوم ہی تھا۔ شاید ڈرائیور ہی نے بر سبیل تذکرہ کہا تھا کہ سرکار کے عقد ثانی نے صاحبزادی فاخرہ کو بہت مکدّر و برہم کر رکھا ہے! لیکن خود بیگم صاحبہ ہی کہاں ہیں۔؟ دانش نے سوچا۔ کیا انہیں شوہر صاحب کی اس خطرناک حالت کا ابھی تک کوئی علم نہیں ہوا۔؟ لیکن ان کی پوزیشن صرف معالج کی تھی۔ گھر کے کسی فرد کا سی نہیں شاید ان کو استفسار بیرسٹر صاحب کو گراں گزرتا۔ لہٰذا وہ خاموش بیٹھے رہے لیکن سوچ رہے تھے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔؟

پھر بیرسٹر صاحب اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور بولے:

"دانش میاں۔ ایک عرض ہے۔ اگر تم مان لو تو پھر۔!"

"فرمایئے۔" نہایت سعادت مندی سے دانش نے کہا۔

"مجھے تم اپنے گھر لے چلو۔"

"اپنے گھر؟؟۔" دانش حیرت و تعجب کے مارے بُت بن گئے۔

"ہاں۔! اس گھر میں میں مرنا نہیں چاہتا۔ اسپتال میں غیروں کے درمیان بھی دم توڑنا مجھے گوارہ نہیں۔ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔ وہاں تم میرے پاس رہو گے۔ مجھے نہایت سکون اور اطمینان رہے گا۔ کہ مرتے وقت کوئی اپنا تو ہے۔ جو میرے سرہانے یٰسین شریف پڑھ رہا ہے۔ میرے منھ میں پانی ٹپکا رہا ہے۔ دانش میاں۔ اب کوئی نہیں ہے میرا۔ تمہارے سوا۔ میں نے دیکھ لی اولاد کی محبت۔ غیروں کی شقاوت۔ اور اپنوں کی بے گانگی۔ میں تمہیں بہت اچھا بچہ سمجھتا ہوں۔! مجھے لے چلو۔ دانش میاں۔ ایک

بیکار، بیمار، تھوڑے عرصے کا مہمان، ایک لاوارث آدمی سمجھ کے! لے چلو بیٹے، لے چلو۔ شاید۔ وہاں تمہاری اور میری دونوں کی مرادیں پوری ہو جائیں!۔"

انہوں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دفعہ پھر ان کے پژمردہ چہرے پر پسینہ چمکنے لگا!!۔

بیگم کریمی معہ عافیہ اور حمزہ کے اپنے وطن واپس آگئی تھیں۔ پھر انہوں نے نہ تو اپنے پرانے محلّہ میں قدم رکھا نہ ہی بیت الکریم کی طرف کوئی گیا۔! حمزہ سب کو سیدھا ایک متوسط ہوٹل لے گیا تھا۔ یہاں نہ تو کرایہ زیادہ تھا اور نہ طعام کے مصارف ناقابلِ برداشت تھے۔!

بیگم کریمی گھبرا رہی تھیں۔ عجیب ویران سا کوئی مقام تھا ہوٹل بھی اتنا آباد اور ترقی پسند نہ تھا۔ انہیں دوپہر اور رات کا کھانا بہت واہیات ملا تھا۔ جلی ادھ جلی روٹیاں، جن کے کنارے موٹے تھے، ابلے ہوئے چاول، اور ہریا پانی کی سی چنے کی دال۔ آلو اور پالک کے ساگ کی بدمزہ بھجیا۔!

عافیہ بہت بُرا سا منہ بنائے ہوئے تھی۔ حمزہ بولا: "آپا میں تمہیں اور امّی کو شیراز ہوٹل سے بریانی لا کے کھلا دوں۔ تمہارا پیٹ نہیں بھرا اور امّی بھی شاید بھوکی ہیں۔!"

"نہیں نہیں۔ اب کچھ نہ لاؤ۔" بیگم کریمی نے کہا۔ "بس تم کوئی سا گھر تلاش کرو۔ یہاں کچھ بھی نہیں لگ رہا۔ پتہ نہیں۔ رات کیسے گزرے گی۔؟ مجھے تو ابھی سے ہول ہو رہی ہے۔!"

"اور بھیا مجھے بھی گھر پہونچا دو۔!" عافیہ بولی۔ "اب میں ایسی ویسی جگہوں پر رہتے ڈرتی ہوں۔ اس ہوٹل میں شریف آدمیوں کا بسیرا نہیں"

"امی آپ بھی کیوں نہ آپا کے ساتھ چند روز کے لئے چلی جائیے۔" حمزہ نے مشورہ دیا۔ "اب کیا بیرسٹر صاحب آپ کو ہفتہ عشرہ کے لیے اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے۔؟"

"وہ تو زندگی بھر کے لیے رکھ لیں گے۔ مگر میں پل بھر بھی وہاں رہنا پسند نہیں کرتی۔ پہلے کی بات اور تھی۔ اب رشتہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ تم عافیہ کو البتہ پہونچا دو۔ یہاں سچ مچ لوگ اچھے نظر نہیں آتے۔!" بیگم کریمی نے کہا۔ پھر عافیہ سے بولیں: "تم بھی برقعہ پہن کے زینے اترنا۔ زیور پہنے ہو۔ موئی بڑی گھڑی سے محفوظ رکھے۔"

"چلو آپا۔ تمہیں گھر پہونچا کے میں بھی کسی مکان کی تلاش میں جاؤں گا پرانے شہر کے محلوں میں دیکھوں گا شاید کوئی چھوٹا سا مکان گھر مل جائے ہم دو آدمیوں کے لیے گھر چاہیئے بھی کتنا۔ ہائے ہائے میرے ابا جان کا بیت الکریم۔" حمزہ بولا۔

پھر سہ پہر کے قریب بدمزہ پانی کی سی چائے پی کر عافیہ جانے پر تیار ہو گئی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنی ستم رسیدہ ماں کو اتنی جلدی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر چھوڑنا تو اسے تھا۔ بہر حال وہ دل پر جبر کر کے ماں سے ملی۔ اور حمزہ کے ساتھ چلی گئی۔ بیگم کریمی نے اپنے کمرے کا دروازہ

اندر سے بند کرلیا۔ پھر وضو کر کے عصر کی نماز پڑھنے لگیں۔ انہیں بھی بہت سے جذبے ستا رہے تھے!۔ اچانک وہ کتنی بے سہارا اور دربدر ہو گئی تھیں۔ وہ سنہرے دن۔ بے فکر راتیں۔ بے غبار ماحول۔ کہاں تھا اب۔ وہ کسی قیدی کی طرح بے گناہی کی بامشقت سزا بھگت رہی تھیں۔

جانماز پر بیٹھے بیٹھے وہ آنکھوں سے گنگا جمنا بہاتی رہیں۔! ہاتھ اللہ کی جناب میں پھیلے رہے۔!

حمزہ نے عافیہ کو کوٹھی پر اتار دیا۔ اور بولا: "آپا۔ تم اب جاؤ۔ میں بھی چلتا ہوں۔ شام ہو رہی ہے۔ مجھے جلد ہی امی کے پاس بھی تو پہونچنا ہے۔ بے چاری ڈرتی ہیں۔ پھر اللہ نے چاہا تو میں تم سے اور انکل سے ملنے کل آ ؤں گا۔"

"حمزہ — ؟ —" عافیہ کچھ مدھم سے لہجے میں بولی۔ اور اس کی طرف گھومی —!

"کیا۔ آپا۔ ؟"

"یہاں سناٹا سا کیوں ہے۔ ؟"

"ارے آپا۔ کمال کرتی ہو۔" حمزہ ہنس کر بولا۔ "انکل اپنے کسی کام سے باہر چلے ہوں گے۔ یا اپنے کمرے میں ہوں گے۔ ان کے سوا یہاں اور ہے ہی کون۔ تمہارے گھر میں تو سدا سناٹا اور خاموشی ہی رہتی ہے۔!"

یہ کہہ کر حمزہ نے اس سے رخصت چاہی۔!

اور عافیہ من من بھر کے قدم رکھتی اوپر آئی۔! لیکن اسے بیرسٹر صاحب دکھائی نہ دیئے۔! البتہ بوڑھی ملازمہ دالان کی دہلیز پر بیٹھی ملی۔! اس کا چہرہ نجانے کن خیالوں کا غماز تھا کہ عافیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ بڑھیا بھی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔!

"نانی اماں۔ صاحب کہاں ہیں؟" عافیہ نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔
اور جواب میں بڑی بی نے بسم اللہ سے والسلام تک ساری داستان کہہ سنائی۔
"تت۔ تو۔ کیا بیرسٹر صاحب کو۔ ڈاکٹر صاحب۔ اپنے گھر لے کے چلے گئے؟"
عافیہ کے سارے بدن کا خون اس کے گالوں پر سمٹ آیا۔ اور وہ سکتہ زدہ سی کھڑی رہ گئی۔ اب کیا ہوگا۔؟ اس کا بیرسٹر صاحب کے پاس جانا برحق۔ مگر جائے تو کیسے؟
پھر اس کے دماغ میں طغیانی سی آگئی۔!
وہ ابھی دالان میں کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک کمرے سے فاخرہ نکلی اس کے پیچھے راحیل تھا۔
عافیہ نے پہلے پہل راحیل کو دیکھا تھا وہ کچھ سمٹ گئی۔ اور سر پر آنچل اوڑھ کر رُخ پھیر لیا۔
"آگئیں تم۔" فاخرہ نے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "راحیل دیکھا تم نے۔ یہی ہے وہ ڈائن۔!"
"صورت سے تو نہیں لگتیں۔" راحیل نے نہایت غنڈے پن سے کہا۔ عافیہ کا چہرہ جلنے لگا۔ وہ سمجھ گئی وہ فاخرہ کا شوہر ہی ہو سکتا تھا۔
"صورت پر نہ جاؤ۔" فاخرہ بولی۔ "تم تو ان کے گُن دیکھو۔ کمال کیا ہے انہوں نے۔ ایک باپ کو بیٹی سے نفرت دلا کر چھوڑی۔ داماد کا حق غصب کروا یا۔ اور — !"
"اتنے بڑے الزام مجھ پر نہ رکھیے۔!" عافیہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ

بیرسٹر صاحب کی خطرناک بیماری کی خبر سن کر بڑی بجھی سی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اب یہ جلی کٹی اس سے سنی نہ گئی اس کا دل بھرا بھرا آرہا تھا۔ خدا جانے اب کیا دیکھنا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے لبوں سے کہا:

"آپ پوچھ لیجئے اپنے والد صاحب سے۔ میں نے ہمیشہ انہیں اسی بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپ کا حق آپ کو ——!"

"تم ان کی زندگی میں آئیں کیوں۔ لاکھ بڈھے کا دل تم پر آیا ہو۔ وہ تو تھے ہی بوالہوس۔ انہوں نے میری ماں کی زندگی ہی میں ایک چمارن سے پینگ بڑھائے تھے۔ شاید وہ موچی عورت ہی ان کا وارث پیدا کر دیتی۔ مگر اس منحوس کو بھی میں نے نکال باہر کیا تھا۔ ارے وہ تو مرے جارہے ہیں ایک بیٹے کے لیے۔ جیسے کہ خدا نے ان سے معاہدہ کر رکھا ہے کہ ضرور ہی بیٹا پیدا ہوگا۔ حرام کی وہ دولت اکٹھا کر رکھی ہے اس پر کسی نہ کسی ناگ کو بیٹھانا تو ضروری ہے نا۔ سو یہ عورت اس ناگ کو جنم دے گی۔ مگر۔ میں اس کا توڑ بھی جانتی ہوں۔ کچل دوں گی ناگن اور سنپولئے کے سر —— مجھے آخر سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"بڑی بہادر ہو تم ڈارلنگ۔" راحیل نے کہا اور ہنسنے لگا۔

عافیہ نے کبھی کاہے کو ایسی باتیں سنی ہوں گی۔ وہ حیرت زدہ تھی اور قریب تھا کہ وہ غش کر جاتی۔ بڑھی ملازمہ نے کہا:

"بی بی سرکار۔ خدا سے ڈریئے! ایسی باتیں مت کیجئے۔ ارے یہ بے چاری چھوٹی بیگم ابھی ابھی تو آئی ہیں۔ سرکار کی حالت کی خبر سن کر ان کے تو ہوش ہی بجا نہ رہ گئے۔ نہ کہ اوپر سے آپ ——!"

فاخرہ نے جھپٹ کر بڑی بی کا چار بالوں کا سفید جوڑا جکڑ لیا اور ان کے سر کو جھٹکے دیتی ہوئی دانت پیس کر بولی:

"بڑی آئی۔ چھوٹی بیگم کی نانی دادی بن کر۔ چڑیل چھل پائی تجھ سے کس نے کہا تھا کہ تو اس کی تائید کرے۔ رشوت لے مری ہے کیا۔ یا بڑے میاں نے کبھی تجھے بھی رکھیل بنا کے رکھ لیا تھا۔ دے مرے ہیں اپنے حصے سے کچھ۔ خبردار خبردار پھر کبھی کسی کی حمایت میں بولی تو دیکھنا سینے پر چڑھ کے خون پی لوں گی۔ مُردار۔ منحوس کہیں کی۔ لو جی۔ ہمارا کھائیں ہماری رکابی میں چھید کریں۔"

بڑھیا چیخا کی۔ اس کا سر چکرایا کیا۔ مگر فاخرہ نے جب تک اسے گھن چکر نہ بنا دیا۔ نہ چھوڑا۔ بڑھیا سر پکڑ کر زمین پر گری۔ راحیل قہقہے لگا رہا تھا عافیہ دم بخود بس دیکھ رہی تھی۔ اس کی مجال نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر بڑھیا کو فاخرہ کے ہاتھوں سے نجات دلاتی۔ اب تو وہ خود بھی لرز رہی تھی فاخرہ کے جوشِ غضب کا رخ اس کی طرف نہ ہو جائے۔!

اور اس کا رخ اس کی طرف ہو ہی گیا۔ "تم بھی نکل جاؤ۔ سمجھیں۔ تمہارے عاشق زار شوہر کہیں جا رہے ہیں۔ جب وہ آئیں۔ تب تم بھی آنا میں تمہیں ایک سکنڈ کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر تم شرافت سے چلی نہ جاؤ گی تو پھر میں نہیں سمجھ سکتی کہ میرا کیا سلوک ہوگا تمھارے ساتھ۔"

"ڈارلنگ۔ تم زحمت مت کرو۔" راحیل نے ایک آنکھ دبائی اور فحش لہجے میں بولا۔ "اگر تم کہو تو تمھاری ان والدہ محترمہ کا پتہ میں صاف کر دوں"

"میری والدہ کیوں ہوتی۔" فاخرہ نے حقارت سے کہا۔ "میرے والد کی داشتہ کہو۔"

فاخرہ جب وہاں سے راحیل کے ساتھ چلی گئی تو بڑھیا بولی:

"بیٹی۔ جتنی جلدی ہو سکے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ ابھی تو تم نے فقط باتیں ہی سنی ہیں۔ کل کو اپنی عزت و آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ سنا نہیں تم نے۔ سرکار کے شریف داماد کا ارادہ کیا ہے؟ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تمہارے جسم میں ہاتھ لگائے۔ تمہیں دھکے دے کے نکال باہر کرے۔ بیٹی۔ یہ لوگ نیز بد ہیں۔ وہی کریں گے جو کہہ رہے ہیں۔! ان کے دماغوں میں شیطان گھس گیا ہے۔ خدا کا خوف نہیں رہا ہے۔ دولت ان کا دین ایمان ہے۔ اس کے لیے جو کچھ نہ کر گذریں وہ کم ہیں۔ بی بی۔ تم کہو تو میں سواری منگوا دوں۔!"

"نانی اماں۔ میں۔ نہیں جانتی۔ کہ میں کہاں جاؤں۔" عافیہ نے ڈوبتے دل سے کہا۔ اور فوراً سوچا کہ وہ آخر جھوٹ کیوں بول رہی تھی۔ کیا وہ ڈاکٹر دانش کے گھر کا پتہ نہیں جانتی؟ لیکن وہ ان کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دانست میں اس کی کوئی صورت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دانش منہ کو دکھاتی۔ نہ اس میں اتنی ہمت تھی جو وہ اُن سے نظریں چار کر سکتی اور نہ اتنی جرأت تھی کہ ان کی باتیں سن سکتی۔

اسے ابھی تک اپنے قول و قرار لفظ بہ لفظ حرف بہ حرف یاد تھے۔ کیا دانش کو یاد نہ ہوں گے؟۔

مگر اسے تعجب تھا۔ حیرت تھی۔ دانش کب یہاں آ گئے۔ اور کیونکر بیرسٹر صاحب اس کے گھر چلے گئے۔ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے دماغ میں اپنے پنجے گاڑے کھڑا تھا۔

کون سا انقلاب آ گیا تھا اس عرصہ میں؟

"جاؤ بیٹی۔ آخر کیا سوچ رہی ہو۔" بڑھیا بولی۔ عافیہ چونک

پڑی۔ اور بولی۔ "نانی اماں۔ کیا "وہ" بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے؟"
"سانس جا کے واپس آئی۔" بڑی بی بولیں
"اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر دانش ہی کے گھر گئے ہیں؟"
"اے لو۔ بٹیا کی باتیں۔ ارے کیا میں انہیں پہچانتی نہیں۔ اللہ بخشے۔ بڑی بیگم کے علاج کے لیے وہ روز آتے ہی تھے۔!"
عافیہ پھر کشمکش میں پڑ گئی۔ کیا کرے کیا نہ کرے؟ یہ آخر بیرسٹر صاحب کو کیا سوجھی تھی کہ وہ دانش کے گھر چلے گئے۔!
دفعتہً وہاں بیرسٹر صاحب کا خاص ملازم آیا۔ اور اس کی نظر عافیہ پر پڑی تھی کہ وہ اچھل پڑا۔ "ارے آپ! بیگم صاحبہ۔ آپ کب تشریف لائیں۔!؟"
"میاں کیسے ہیں؟" بڑی بی نے پوچھا۔ ابھی تک فرش پر پڑی تھی
"کیا پوچھتی ہو نانی۔ رات کو بڑا زبردست دورہ پڑا تھا سرکار پر۔ سب نے امید ہاتھ سے دے دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو بھی بلا لیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ کچھ ٹھیک ہوئے ہیں دانش صاحب کہہ رہے تھے کہ انہیں دل کے اسپتال میں شریک کرا دیں گے مگر ہمارے سرکار کی بھی ایک ہی ضد ہے۔ انہیں قسم دے دی ہے اب تو یہ ہو رہا ہے کہ نہ تو سرکار دوائی رہے ہیں۔ نہ کوئی انجکشن لے رہے ہیں۔ نہ اسپتال جانے پر راضی ہو رہے ہیں۔ سرکار کی بے ہوشی میں ایک انجکشن دانش صاحب نے دے دیا تھا۔ ہوش میں آئے تو پتہ چلا اور پھر دانش صاحب کو اس قدر خفا ہوئے کہ وہی تھے جنھوں نے

اتنی بری بھلی سن لی۔ کوئی دوسرا اگر ہوتا تو ___!"

"مگر۔ کیوں؟ ۔" عافیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔ سرکار ۔!" ملازم عاجزی سے بولا

"اب آپ آگئی ہیں نا۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کیا آپ چلیں گی۔ میں ڈرائیور سے کہہ کے گاڑی نکلواؤں۔؟"

ہاں۔! مگر میں پہلے اپنی امی سے ملنے جاؤں گی۔ پھر___" عافیہ بولی۔ ملازم نے اسے حیرت سے اور غور سے دیکھا پھر گاڑی نکلوانے چلا گیا۔

بیگم کریمی اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ عافیہ نے ان سے سارا قصہ بیان کر دیا تھا اور پھر پوچھا۔

" اب بتائیے۔ میں کیا کروں گی۔ مجھ سے تو اس گھر میں جایا نہ جائے گا۔ امی صرف آپ جائیے۔ مجھے تو دہشت سی لگی ہے۔ نجانے ان کا کیا حال ہے۔ بڑی بی نے تو بہت تشویش ناک صورت حال بتائی تھی"۔

"اے بی بی۔ میں ہی کون سی صورت لیکے جاؤں گی۔" وہ بولیں "ہمیشہ سے وہ لڑکا مجھ پر بھروسہ کرتا رہا۔ میں نے بھی اس سے کہا تھا کہ وعدہ خلافی نہ ہوگی نہ کہ ادھر پانسہ ہی پلٹ گیا۔ جو خدشہ تمہیں ہے۔ وہی مجھے بھی تو ہے۔ تم تو پھر یہ کہہ کر شرمندگی مٹا سکتی ہو کہ تم بزرگوں کی پابند تھیں۔ مگر ہم کون سا عذر کریں گے۔ یا اللہ کس مشکل میں جان پڑی ہے۔ اور ان حالات میں بیرسٹر صاحب کی مزاج پرسی بھی بیحد ضروری ہے۔ انہیں ابھی تک تو یہی معلوم ہے کہ تم یہاں نہیں ہو مگر تمھارے نوکر انہیں تمھاری آمد کی اطلاع دیں گے تو انہیں کتنی

شکایت ہوگی اور یہ ہمارے لیے بھی ناممکن ہے کہ ہم یہ سب سن سنا کر بھی نہ جائیں۔"

"یہ بھلا اُن کے گھر میں کیوں جا کے پڑ گئے۔؟" عافیہ بولی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔؟

"ہرچہ بادا باد۔" بیگم کریمی صاحب نے کہا۔ "چلنا تو ہے۔ چاہے جیسی بھی صورت ہو کے جائیں .... مگر۔ یہ پتہ نہ چلا کہ دانش میاں آ کب گئے؟"

عافیہ چپ رہی۔ بیگم کریمی نے جلدی جلدی لباس بدلا۔ برقعہ پہنا اور اور حمزہ کے لیے دوسطری پرچہ لکھ کر کہ وہ دانش صاحب کے یہاں جا رہی ہیں۔ پرچہ کنڈی میں اٹکا کر چلی گئیں۔

راستے بھر وہ سوچتی رہیں کہ خدا جانے کیا دیکھنا ہو۔ عافیہ الگ خلجان میں مبتلا تھی۔ دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے خیالات میں گم رہیں۔

حقیقت تو یہ تھی کہ بیرسٹر صاحب نے دانش کا "ناخواندہ بیمار" بن کر انہیں عجیب سی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا!۔ وہ آئے تو تھے کہ ان سے طبّی مدد لیں۔ مگر مدد تو ایک طرف رہی۔ انہوں نے دانش کے لیے بڑے صبر آزما حالات پیدا کر دیئے تھے۔ عالم یہ تھا کہ دل کے دو دورے بڑے جان لیوا پڑ چکے تھے۔ ان کے لیے بستر سے حرکت کرنا بھی مہلک تھا مگر وہ تھے کہ نہ صرف حرکت کرتے تھے بلکہ اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود نہ صرف چلتے پھرتے تھے۔ نہایت پابندی سے نمازیں پڑھتے تھے۔ بلکہ دانش کے ہزار سر پیٹنے پر بھی تہجد کی نماز ادا کرتے تھے! اور پھر تین بجے رات سے صبح فجر تک تسبیح پڑھا کرتے! اس کے بعد صبح ناشتے تک قرآن پاک کی والہانہ تلاوت ـــ!"

گھر والے سخت حیران تھے ۔!

اکیلے میں ظہیر صاحب نے دانش سے کہا : " دیکھ لینا کہ یہ کوئی مقدمہ کھڑا کریں گے ۔ آخر یہ حضرت چاہتے کیا ہیں ۔ تمہاری رسوائی اور بدنامی ؟"

بیگم ظہیر بھی اب بیرسٹر صاحب سے پردہ نہ کرتی تھیں ۔ انہوں نے بھی کہا : " ہم تو چاہتے تھے کہ یہ یہاں رہ کر صحت مند ہو جائیں گے مگر مجھے تو آثار اچھے نہیں لگتے ۔ اللہ نہ کرے ۔ ارے میں کہتی ہوں کہ یہ جان بوجھ کر خودکشی کیوں کر رہے ہیں ۔ ؟ آخر مطلب کیا ہے ؟ اپنا گھر بار اور کاروبار سب کاہے کے لیے چھوڑ رکھا ہے ۔ میں نے تو سنا تھا کہ یہ بڑے تن و توش کے آدمی تھے ۔ مگر اب تو ہڈیوں کا پنجر لگتے ہیں ۔ کچھ دماغ پر تو اثر نہیں ہو گیا کہ نہ تو دوا کھائیں ۔ نہ پرہیز کریں ۔ اللہ نہ کرے کہ اگر کچھ ہو گیا تو پھر — ؟!"

" کچھ ہو گا اور ضرور ہو گا ۔" دانش نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے " ان کا دل اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ اگلے حملے کی تاب نہ لا سکے گا ۔ !"

" تو پھر ۔ ؟" ظہیر صاحب نے کہا

" عرض تو کیا تھا آپ نے دست بستہ کہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیجئے ' کیا جواب دیا ۔ ؟" دانش نے پوچھا

" میاں مجھے تو وہ کچھ فاتر العقل لگتے ہیں ۔" ظہیر صاحب نے کہا مجھے یہ جواب دیا تھا کہ ۔ بس میں مرنا چاہتا ہوں ۔ اور دانش کے سامنے مرنا چاہتا ہوں ۔ وہ مجھے بیٹے کی طرح عزیز ہے ۔ بھلا یہ کوئی جواب ہوا ۔ ارے مرنا تو سبھی کو ہے ۔ مگر یوں خوشامد کر کر کے کوئی اپنی موت کو نہیں بلاتا صاحب ۔ یہ تو اس قدر جلد پگھلے ہیں کہ جیسے واقعی موم کے بنے تھے ۔ اس قدر تیزی سے آدمی لاغر نہیں ہو جاتا ۔ انہیں کوئی نہ کوئی غم ضرور ہے ۔

اور وہی انہیں پگھلائے دیتا ہے۔! وہ منھ سے نہ کہیں۔ اس سے کیا؟"
"دانش میاں۔ بیٹے۔ تو ان کے کہے پر نہ جا۔" بیگم گھگھیائیں۔
"ان کو کہنے دے۔ بلا سے۔ تو تو بیٹے۔ ان کا علاج کر۔ بس خفا ہی ہو جائیں گے نا۔ برداشت کر لینا خفگی۔ باپ کے برابر تو ہیں۔"
"غضب تو یہ ہے امی کہ انہوں نے مجھے بڑی بڑی قسمیں دے رکھی ہیں۔ کل میں پاس جا بیٹھا تھا۔ کلام پاک پڑھ رہے تھے۔" دانش نے بے بسی سے کہا۔ "میں نے عرض کی کہ قبلہ ایک خوراک آپ کم از کم دواہی کی پی لیجئے۔ مجھ سے کہا کہ ذرا کلام پاک تو تھام لو۔ میں نے ان کے ہاتھ سے لیا۔ بس پھر یہ کہا کہ تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب ہے۔ اب وعدہ کرو کہ ہوش میں اور بے ہوشی میں قطعی مجھے دوا انجکشن نہ دو گے۔ ۔ ۔ ۔ اب میں کیا حلف لے کر ایک گناہ کر سکتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچیں ہیں؟۔"
"اب کیا کر رہے ہیں؟۔" ظہیر صاحب نے بڑی تشویش سے پوچھا۔
"ارے ابا جی۔ میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔" دانش نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "زبردستی بستر پر لٹا آیا ہوں۔ سینے میں درد بتا رہے تھے۔ خدا ہی ان کے حال پر رحم کرے۔ اب کی اگر دورہ پڑا تو بس خاتمہ ہی سمجھئے۔"
"ہائے ہائے!" بیگم ظہیر بولیں۔
"میں دیکھ آؤں۔!" ظہیر صاحب بولے اور چلے گئے۔
دانش کے والدین اور لڑکوں نے واقعی مہمان داری اور خدمت کا حق ادا کر دیا تھا۔ ہر وقت دانش بیرسٹر صاحب کے آس پاس پھرا

کرتے۔ ظہیر صاحب اور ان کی بیوی بھی خاطر میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھتے۔ لڑکے ہر خدمت کے لیے تیار رہتے! حتیٰ کہ وہ جب تہجد کے لیے اُٹھتے تب تابش اٹھتا اور انہیں پانی گرم کر کے دیتا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی اپنا بزرگ کہیں بڑی دور سے بہت دنوں بعد اپنوں میں واپس آیا ہے۔ بیرسٹر صاحب کا حال عجیب تھا۔ وہ بھی کسی قسم کا کوئی تکلّف نہیں کرتے تھے۔! اور ان کے اس سلوک پر سب بے حد حیران تھے۔!

ظہیر صاحب جب ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر بیٹھے گھٹنے پر کاغذ رکھے کچھ لکھنے میں مصروف ہیں! ظہیر صاحب کو دیکھ کر مسکرائے مگر ظہیر صاحب نے مسکراہٹ کے جواب میں خفگی سے کہا "تو آپ نے قسم ہی کھالی ہے کہ وہ ہرگز نہ کریں گے جو دانش بحیثیت ایک معالج کے آپ سے درخواست کرتا ہے۔"

"بھائی صاحب۔ دانش بچہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں آج کا مرتا کل مروں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ کل کا مرتا آج مروں۔" بیرسٹر صاحب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ "مگر آپ بھی تو سوچئے کہ آخر وہ زندگی جو بہر حال ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بچانے کے لیے یہ طفلانہ تدبیریں کیوں کی جائیں۔ دوا، انجکشن، آرام۔ پرہیز۔ تیمار داری۔ دوا اور دعا بھائی میرے۔ یہ سب آدمی نے دل کو تسلّی دینے کے مختلف بہانے بنا رکھے ہیں۔ آپ سمجھے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ موت کے سامنے اور مشیت الٰہی کے مقابلے پر دوا اور دعا دونوں ہی بے کار ہیں۔ اگر دوا کسی کو زندگی دے سکتی تو آج کوئی بادشاہ نہ مرتا۔ اور دعا اگر درازئ عمر و صحت کا سبب بن سکتی تو کسی پیغمبر کو موت نہ آتی۔ لہٰذا میرا دل سب سے اچاٹ ہو گیا۔"

"آپ ہیں جناب قانونی آدمی۔ میں لفاظی میں آپ سے جیت نہیں سکتا۔" ظہیر صاحب نے کہا۔ "مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح جان بوجھ کر موت کا استقبال بھی کوئی نہیں کرتا۔"

"واہ جناب۔" وہ پھر ہنسنے لگے۔ "تو پھر خودکشی کرنے والوں کو آپ کیا کہیں گے۔؟"

"ارے انہیں کوئی مجبوری ہوتی ہے۔ وہ بزدل ہوتے ہیں۔ حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہار جاتے ہیں۔!" ظہیر صاحب نے جواب دیا۔ "مگر خدانخواستہ آپ کو کیا مجبوری ہے۔ آپ کیوں جان بوجھ کر خود کو موت کے حوالے کر رہے ہیں؟"

"ظہیر صاحب۔" اب کی وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "کبھی نہ کبھی تو انسان کو خود سے بھی شرم آتی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو آدمی اپنی کسی خطا کا مداوا چاہتا ہے۔"

"لیکن اس طرح؟" ظہیر صاحب نے کہا۔

"ہاں ظہیر صاحب۔ اسی طرح۔ میں زہر کھا کر حرام موت مرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ نہ دین کے نہ دنیا کے۔ مگر یہ موت جو قدرتی ہوگی۔ اس سے تو میں بری الذمہ ہوں گا!۔"

"قطعی نہیں۔ آپ یہ بھی آہستہ آہستہ خودکشی ہی کر رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ آپ کے لیے اس طرح بیٹھنا نامناسب ہے۔ مگر آپ نہ صرف بیٹھے ہیں بلکہ غالباً کسی مقدمہ کی روداد بھی تحریر فرما رہے ہیں۔"

"نہیں۔!" بیرسٹر صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ "یہ وہ اعمال نامہ ہے جس کی تحریر کے لیے میں اپنے فرشتوں کو تکلیف دینا

نہیں چاہتا۔ اور نہ ان کے اعلان کے لیے حشر کا منتظر رہنا چاہتا ہوں یہ اعمال تو وہ ہیں جو فوراً اور دنیا والوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے۔"

ظہیر صاحب کو یقین ہو گیا کہ واقعی بیرسٹر صاحب کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ وہ خاموش ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ اور بیرسٹر صاحب نے پھر پیڈ کا زاویہ درست کر کے از سر نو لکھنا شروع کر دیا۔!

دفعتہً کمرے میں بیگم ظہیر آئیں اور بولیں: "اے بھائی صاحب۔ سنیئے تو۔ وہ آئی ہیں۔ کریمی صاحب کی بیوی۔ لے آؤں انہیں یہاں؟"

ظہیر صاحب نے طویل سانس لی۔ اور بیرسٹر صاحب نے اپنا لکھا ہوا دفتر کا دفتر جلدی سے تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔ ابھی وہ اجازت دے نہ سکے تھے کہ بیگم کریمی اور برقعہ میں لپٹی عافیہ کمرے میں داخل ہوئیں۔!

ظہیر صاحب اور ان کی بیوی مختصر سی علیک سلیک کے بعد چپ چاپ کمرے سے چلے گئے۔!

عافیہ نے اکیلے میں نقاب الٹا۔ اور یکبارگی دھک سے رہ گئی۔ اس کے سامنے مسہری پر ہڈیوں کا ڈھانچہ رکھا تھا۔! ماں کا خیال کئے بغیر وہ حیرت سے بولی:

"یہ آپ کی کیا حالت ہو گئی ہے۔" پھر اس نے نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔ بیگم کریمی بھی سخت متاسف اور کچھ مبہوت تھیں!

"تشریف رکھیے۔!" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ اور پھر عافیہ سے بولے: "تم بھی بیٹھ جاؤ۔!"

عافیہ کا حال عجیب تھا۔ دہشت۔ حیرت۔ پریشانی۔ ندامت۔ دانش سے سامنا ہونے کا خیال۔ اس کا چہرہ گوناگوں جذبات کا

آما جگاہ بن کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ اور ڈوبتی سماعت سے سننے لگی کہ نجانے اس کی ماں اور وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ اسے تو بس یہی دھڑکا لگا تھا کہ دانش اب کمرے میں آئے کہ تب آئے۔ اس کا دل رہ رہ کر دھڑک اٹھتا تھا۔ ہر چاپ پر اس کے کان دہکنے لگتے تھے۔ اور ہاتھ پیر سرد ہو جاتے۔!

پھر وہ دفعتہً عافیہ سے مخاطب ہو گئے: "مجھے پتہ نہ چلا تم کب آئیں؟"

"کل آئی تھی۔" عافیہ نے سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر کہا

"کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔؟"

"پہلے گھر گئی تھی۔ وہاں بڑی بی سے معلوم ہوا۔"

"تم فاخرہ سے ملیں۔"

"جی ہاں۔!"

"اس کا شوہر بھی ہو گا۔!"

"جی ہاں!"

"اب وہ وہیں رہیں گے۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "میں یہاں رہوں گا۔ اور تم۔ تمہارا بندوبست ـــــ!"

عافیہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔! پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں وہ پھر بولے: "عدن باغ کے قریب والی کوٹھی ایک دن میں نے تمہیں دکھائی تھی نا؟"

"جی۔!"

"تو اب تم اس میں رہو گی!"

"کیوں؟" حیرت کی شدت سے پاگل ہو کر عافیہ نے پوچھا۔

"کیونکہ۔!" بیرسٹر صاحب نے کہا اور پھر یکایک چپ ہو گئے۔

ظہیر صاحب اور ان کی بیوی حیران تھے۔ اگر کریمی صاحب کی بیوی بیرسٹر صاحب کی عیادت کے لیے آئی ہیں تو پھر عافیہ کیوں آئی تھی۔ اس کا شوہر کہاں ہے۔ وہ خود اب تک کہاں تھی؟ وہ لوگ متحیّر سے تھے اور بیرسٹر صاحب کے ڈرائیور کو پہچانا تھا۔ وہ بھی حیران حیران سے اندر آئے کہ کہیں بیرسٹر صاحب کو کسی جگہ جانے کی تو نہیں سوجھی تھی۔!

صحن ہی میں تھے کہ چھوٹے بھائی طلحہ نے فرطِ مسرّت سے ہکلاتے ہوئے کہا: "

"بھائی جان۔ عافیہ آپا آئی ہیں۔!"

"عافیہ!" ایک شاک سا دانش کو لگا۔ چہرہ گلنار ہو گیا۔

"جی ہاں۔ چچی بی کے ساتھ ہیں۔ اور اندر کمرے میں ہیں!" طلحہ بولا۔

"ان کے ساتھ کیا کوئی صاحب بھی ہیں؟" دانش نے پوچھا

"جی نہیں۔ صاحب واہب تو کوئی نہیں۔ صرف چچی بی ہیں" طلحہ بولا۔

دالان میں آئے تو بیگم ظہیر نے بھی یہی اطلاع دی۔!

"ان کے شوہر نہیں آئے ساتھ؟" دانش نے مردہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔! مگر بے چاری عافیہ عجیب بھولی بھٹکی سی لگی۔" بیگم ظہیر نے چپکے سے کہا۔ "وہ چونچالی۔ شادابی اور رُدہت ہی جیسے باقی نہیں کہی شاید میاں سکھ سے نہیں رکھتا۔!"

"اللہ اللہ۔!" دانش نے جیسے بے خبری میں کہا۔

"آپ ملئے گا نہیں ان سے؟" تابش نے پوچھا۔

"کیا کروں گا مل کے۔ کچھ اپنے زخم ہرے کروں کچھ اس کے کھرنڈ چھیلوں۔ نہیں ملوں گا۔ جیسی آئی ہے۔ ویسی چلی جائے گی۔ میں اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔!" دانش نے کہا۔

"میں اس سے پوچھوں کہ بی بی تمہارے میاں کہاں ہیں۔ کیوں نہیں آئے؟" بیگم ظہیر نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" دانش نے کہا۔ "یہ بات آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اُسے خفیف مت کیجئے۔!"

"مگر یہ بیرسٹر صاحب کو دیکھنے آئی کیسے ہے؟" وہ پھر بولیں

"چچا صاحب مرحوم کے بیرسٹر صاحب کے گہرے مراسم تھے۔" دانش نے جواب دیا۔ "باپ کے دوست کی سنجیدہ علالت کی خبر سنی ہوگی بس، خیریت معلوم کرنے آگئی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نجانے کیوں سر جھکا لیا اور فرش کو تکنے لگے! ان کے ذہن میں بھی سناٹے چھا رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ عافیہ کے سامنے جا کھڑے ہوں۔ اسے دیکھیں۔ اور دماغ روک رہا تھا۔ نہیں۔! یہ نادانی مناسب نہیں۔ شاید وہ بُرا مانے اب وہ اپنی نہیں۔ پرائی ہے۔ انہوں نے ایک طویل سانس لی۔ اور پھر بے معنی انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر نجانے کیوں ان کا دل خلش آمیز طریقے سے دھڑکنے لگا۔!

"اُو معبود۔ میری محبت۔ میری زندگی مجھ سے اتنی قریب ہے۔ مگر میں اس سے کتنی دُور ہوں۔!"

دفعتہً بیگم کریمی کی دہشت بھری چیخ سی گونجی۔ "ظہیر بھائی۔ دوڑیئے۔ ارے۔ یہ انہیں یکایک کیا ہو گیا ہے۔ گر پڑے ہیں۔!"

بے تحاشہ سب کے سب بیرسٹر صاحب کے کمرے کی طرف بھاگے !۔
دانش جھپٹ کر آگے بڑھے۔ اور اپنا اسٹیتھسکوپ میز پر سے اٹھا کر بیرسٹر صاحب کے دل پر رکھ دیا۔ وہ اپنے بستر پر سیدھے لیٹ گئے تھے اور تقریباً بے ہوش تھے !۔

"کیا ہوا۔ ؟" ظہیر صاحب نے بدحواس ہو کر بیگم کریمی سے پوچھا۔
"بھیا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک رونے لگے۔" وہ تو کانپ رہی تھیں۔ "اور پھر جیسے اُچھو لگ گیا۔ یکبارگی تکیے پر گر پڑے۔"
"دانش ؟" بیگم ظہیر نے ڈرتے ڈرتے آواز دی
"امی۔ خدارا آپ سب لوگ خاموش رہئے۔" دانش پاگل ہونے لگے۔ "ان کی حالت نازک ہے اور خطرناک ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میرے ہاتھوں پر انہوں نے قرآن رکھ دیا۔ میں کسے بلاؤں۔ کیسے حلف توڑنے کا گناہ کروں۔ اوہ خدا۔ رحم کر۔"
"میں تو پابند نہیں ہوں حلف کا۔ میں لاتا ہوں۔ کسی ماہر قلب کو۔" تابش بولا اور باہر بھاگا !۔
دانش جلدی جلدی بیرسٹر صاحب کا سینہ سہلانے لگے۔ ان کا پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ اور چہرے پر ہلدی پھری ہوئی لگتی تھی !۔ دانش کے سمجھنے میں کیا دیر لگتی کہ یہ بس آخری دورہ ہے۔ جو شاید انہیں کچھ کہنے کی بھی مہلت نہ دے۔ !
انہوں نے آلہ سینہ بین اٹھا لیا اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔
سب ادھر ادھر کھڑے امید و بیم کی ملی جلی کیفیت میں مریض و

معارج کو دیکھ رہے تھے!۔

عافیہ کی نظریں دانش پر تھیں اور دل قلابازیاں کھا رہا تھا۔

دفعتہً بیرسٹر صاحب نے پلکیں جھپکائیں اور نہایت مدّھم آواز میں انہوں نے پکارا۔

"دانش ۔؟"

"جی۔ جی ہاں۔ میں آپ کے پاس ہوں۔" دانش ان پر جھکے کیا کیفیت ہے۔ آنکھیں کھولیے جناب!۔"

مگر کھولتے ہی کھولتے ان کی پلکیں بند ہونے لگیں۔ البتہ لب ہلے

"عافیہ!۔"

عافیہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دانش نے بدحواسی میں اسے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے بولے۔

"عافیہ ۔ عافیہ پاس آؤ۔!"

کسی نے اسے آگے بڑھا دیا۔ اور وہ کانسی کے بے جان مجسمہ کی طرح مسہری کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ نہ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تھی نہ دیکھنے سننے کی طاقت۔! وہ کہاں تھی۔ کیا ماحول تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی یہ کیا ہو رہا تھا۔

"انہیں آواز دو۔" دانش نے بیرسٹر صاحب کی ردّی حالت دیکھ کر کہا۔ "تم کیا کہتی ہو انہیں۔ انکل یا چچا۔ جو کچھ بھی کہتی ہو۔ کہو۔ پکارو انہیں۔"

چچا'؟ عافیہ گرنے لگی۔ یا خدا۔ کیا انہیں کچھ نہیں معلوم؟ بیگم کریمی کا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا۔ سر جھک گیا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور حمزہ اندر آیا۔

کیا ہوا۔ کیا ہوا۔" وہ بھی بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ "مجھے ابھی شیراز سے معلوم ہوا۔ کیا ہوا ہے انکل کو۔ آپا۔؟۔"

اور عافیہ یکبارگی چکرا کر گر پڑی۔

"دانش بھائی۔ کچھ کیجئے۔" حمزہ چلاّ پڑا۔ "اف یہ کیا ہو رہا ہے آپا اس صدمہ کو کیوں کر برداشت کریں گی۔؟"

"کیا۔ میں نہیں سمجھا۔" دانش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے حمزہ کو دیکھا۔! "تمھاری آپا سے۔ کیا مطلب ہے۔ ان سے کیا سروکار ہے؟!"

"حمزہ۔؟" بیگم کریمی ہکلائیں۔ مگر شدتِ غم سے دیوانہ حمزہ بول پڑا۔ "کیسے مطلب نہیں ہے دانش بھائی۔ کیا وہ بالکل بے سروسامان رہ جائیں گی۔ ہائے ان کے نصیب۔ پہلے اباجان نے ساتھ چھوڑا۔ اور اب شوہر۔؟۔" وہ سسکنے لگا۔!

"شوہر۔؟" دانش پر بجلی سی گر پڑی۔

"جی ہاں۔ اباجان نے مرنے سے پہلے آپا سے انکل کا نکاح کر دیا تھا!" حمزہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا۔؟" دانش کے پیروں تلے سے زمین اور سر سے آسمان ہٹنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح باری باری بیرسٹر صاحب اور عافیہ کو گھورنے لگے۔ ایک پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔ دوسرا ابھی اسی کیفیت سے دوچار تھا نالش اپنے ساتھ ڈاکٹر خان کو لے آیا تھا۔ انہوں نے بیمار کا اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر سیدھے ہو کر حاضرین پر ایک ملامت خیز نظر ڈالی اور پھر ڈاکٹر دانش سے بولے:

"تعجب ہے کہ آپ نے بھی مجھے بلانے کی ضرورت سمجھی ہے! آپ ہی انہیں کسی اچھے نرسنگ ہوم کیوں نہیں لے گئے۔ کیا سمجھے تھے آپ کہ اب تک گھر ہی میں ڈالے رکھا؟ ہوپ لیس۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ جناب۔!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا اسٹھےٹس کوپ توڑ موڑ کر بیگ میں رکھا۔ اور سر جھکا کر کمرے سے نکل گئے۔!

کمرے میں بھن بھناتا سا آہ و بکا کا شور ابھرا۔ مگر ابھی بیرسٹر صاحب میں اتنی جان باقی تھی کہ انھوں نے پھر آنکھیں کھولیں۔ اور باری باری دانش اور پھر سر گھما کر اُدھر دیکھا جہاں صوفہ پر عافیہ پڑی تھی۔ پھر ان کی نظریں دانش پر ٹھہر گئیں۔ انہوں نے بمشکل کہا:

"دانش میاں۔ میرے تکیے کے نیچے۔ وہ خط۔ وہ خط۔ جو میری وصیت ہے۔ وہ۔ تم۔ تم نکال کے پڑھنا۔ اور جو کچھ۔ اس میں۔ میں نے لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔۔۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ ورنہ۔ یہ۔ سمجھو کہ۔ نہ تو۔ میری مٹھ۔ قبر میں لگے گی۔ اور۔ نہ۔ میری روح کو آسمان پر۔ آسمان پر۔ قرار آئے گا۔ دعا کرو۔ دعا کرو۔ اللہ۔ میری یہ مشکل۔ آسان۔ آسان کرے۔ تم۔ مجھے۔ مجھے معاف کر دینا۔ تم۔ اور عافیہ۔ اللہ۔ اللہ۔ عافیہ کہاں ہے۔ اس سے بھی کہو کہ مجھے ۔۔۔۔ !"

اور بس۔ وہ اتنی قدر کہہ سکے تھے کہ اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ بڑی جلدی سارا کھیل ختم ہو گیا تھا۔

شاید بیرسٹر صاحب اس بات کے منتظر تھے کہ ان کے پاس سب اکٹھا ہوں اور وہ سب کے درمیان جان دیں۔!

بڑا ہولناک وقت تھا۔ درد دیوار پر شام کا سوگوار دھندلکا چھانے لگا تھا۔ زرد زرد دھوپ کی آخری مردہ کرنیں آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھیں خنک اور خشک ہوا آہیں سی بھرتی لگ رہی تھی۔!

سب لاش کے اطراف بیٹھے تھے۔ اور عافیہ ابھی تک بیہوش پڑی تھی!!

دانش میاں !۔

"شرمندہ ہوں۔ بے حد شرمندہ۔! اپنے گناہوں کا اعتراف زبان سے کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ تبھی تو قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ جب تم ان سطروں پر اپنی متعجبانہ نگاہیں دوڑا رہے ہو گے تو میری گناہ گار و شرمسار روح آسمانوں پر بھی کتنی نادم اور خجل ہو گی۔ بشرطیکہ یہ آلودہ و ملوث روح آسمان پر پہونچ سکی۔!

دانش میاں۔ سنا ہے کہ دل کی گہرائیوں سے کی ہوئی توبہ کبھی کبھی درِ بخشش تک پہونچ جاتی ہے اور اسی امید پر میں بھی توبہ کرتا ہوں شاید خدا بخش دے۔ اور شاید تم بھی مجھے معاف کر سکو۔!

میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ میں اپنی فردِ جرم کو کہاں سے شروع کروں۔ کہاں ختم کروں۔ اعمالِ بد کا سلسلہ طویل ہے اور الفاظ کا ذخیرہ محدود۔ لیکن بے ربط سہی۔ غیر مسلسل سہی۔ وہ سب کچھ تو کہہ ہی دوں گا۔ جو بہت دنوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ تاکہ دل پر رکھا ہوا بوجھ ہلکا ہو سکے دعا مانگتا ہوں کہ اس وقت تک مجھے موت نہ آئے جب تک کہ میں اپنی روح پر منڈھی ہوئی غلاظت کو روح پر سے چھڑا نہ لوں۔

میں کس طرح بیان کروں کہ میں نے تمہارے اور عافیہ کے سلسلے میں کتنے گناہ مول لیے ہیں۔ شاید تم کو یقین نہ آئے کہ مجھ سا معمر، سنجیدہ اور "ثقہ" آدمی یہ سب کچھ کر بھی سکتا ہے۔ جو میں نے کیا ہے۔ لیکن میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ انھیں اور عافیہ کو قطعی فراموش کر کے کیا ہے!

تم سوچو گے کہ بار بار عافیہ کا نام کیوں لے رہا ہوں۔ تو سنو کہ۔ قدرت نے یا میری بدبختی نے اسے کس طرح مجھ سے منسوب کر دیا تھا۔!

میں نے پہلے اس مظلوم لڑکی کو تمہاری ڈسپنسری میں دیکھا تھا۔ اور اپنی عمر و مرتبہ بھول کر اسے اپنے منحوس و مکروہ خیالوں پر مسلط کر لیا۔ اس

کے بعد میرا مجرمانہ دماغ ایک بری راہ پر چل نکلا۔ میں نے تم سے اس کے والد کا پتہ پوچھا اور ایک روز ان کے گھر جا پہونچا۔ ان سے خواہ مخواہ اپنی دیرینہ شناسائی ظاہر کی۔ جھوٹ پر جھوٹ بولے۔ انہیں دھوکے پر دھوکے دیئے حالانکہ وہ بے چارے اپنی جگہ سچ بول رہے تھے کہ وہ مجھے نہیں جانتے اور میں مصر تھا کہ میں کبھی ان کا ہم جماعت تھا۔ یہ قطعی غلط تھا سراسر جھوٹ تھا۔ میں کبھی ان کا یا وہ کبھی میرے ہم جماعت نہیں رہے لیکن میرے اصرار پر بے چارے کریمی صاحب بھی میرے قول پر ایمان لے آئے۔

میں نے خود کو ان کا دیرینہ دوست، ناصح، مشفق ظاہر کیا۔ ان پر مراعات و نوازشات کی بارش برسا دی۔ اپنی شیطنت اور بوالہوسی کی کی تکمیل کے لیے۔!

آہ۔ اب میں کیسے کہوں کہ جب مجھے پتہ چلا کہ تم عافیہ کے منگیتر ہو۔ تو۔ میرے دل پر کیا گزری۔ میں تمہیں راستے سے ہٹانے اور عافیہ کو اپنانے کے خواب دیکھنے لگا!۔ میری راہ کے ۲ روڑے تھے۔ ایک تم اور دوسری میری دائم المریض بیوی۔! میں چاہتا تھا کہ تم دونوں میرے راستے سے ہٹ جاؤ!! اس کے مواقع میری بدبختی نے فراہم کر دیئے۔ میرے ناقص علاج کروانے سے بیوی ختم ہوئیں۔ پھر یہ پتہ چلا کہ تم بھی ایک عرصے کے لیے باہر جا رہے ہو۔ میری راہ ہموار ہو چکی تھی! لیکن میں شیطان اور گناہ گار بس اسی کشمکش و پنج میں پڑا ہوا تھا کہ آخر وہ لڑکی میری ہوگی کیسے؟ کیوں کر؟ کس طرح؟؟۔

دانش۔ جس طرح نیک کاموں میں اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اسی طرح شیطنت کی اسکیموں میں ابلیس خوب مدد کرتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے مجھے ایک راہ سجھادی۔ میرا دماغ ہمیشہ ہی شرمناک جوڑ توڑ کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ جال جو میں نے بچھایا تھا۔ وہ سب پر بازی لے گیا۔!

معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔ دانش تم بھی۔ عافیہ! تم بھی۔ میں دست بستہ معافی مانگتا ہوں۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ مجھے جہنم کا مستحق قرار دو۔ مگر خدارا معاف

بھی کر دو۔ کیونکہ میں اپنے اس گھناؤنے اور شرمناک فعل کی تفصیل لکھوں گا قلم رک رہا ہے۔ جسم پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ اور تم لوگوں کی وہ نظریں مجھے دکھائی دے رہی ہیں جن میں تعجب ہوگا، حیرت ہوگی۔ نفرت ہوگی۔ مگر جب میں سب کچھ کہہ ہی رہا ہوں تو پھر۔ اتنا کیوں نہ کہہ دوں ... میں نے ایک نہایت قبیح اسکیم بنائی۔ اپنی اسکیم میں اپنے دو سزا یافتہ بدمعاش موکلوں کو بھی شامل کر لیا۔ ان بدمعاشوں کے ذریعہ میں نے خود عافیہ کا اغوا کروایا۔ اسے ساری رات اپنی ایک غیر آباد کوٹھی کے کمرے میں بند رکھا۔ اور خود ساری رات اس کے ستم رسیدہ ماں باپ کے پاس بیٹھا انہیں دلاسے تسلیاں دیتا رہا۔ اب مجھ پر کسے شبہ ہو سکتا اور شبہ کی بات ہی کہاں تھی۔ میں ان سب کا سب سے بڑا ہمدرد، غمگسار اور جاں نثار دوست تھا۔ میرا کردار ایسا ہی تھا کہ کسی کو رتی بھر شبہ مجھ پر نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا تھا۔!

بہرحال دوسری صبح جب مظلوم اور بیگناہ عافیہ اپنے گھر پہونچی تو اس کا دامن داغدار اور کردار ملوّث سمجھا گیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا اور وہ سو فیصدی کامیاب ہوا۔ کرمی صاحب بدحواس ہو چکے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ جلد از جلد گناہ کی اس پوٹ کو کسی کے حوالے کر دیں۔ لیکن انہیں اتنی جلدی کون ملتا جو اُن کی دانست میں ان کی لڑکی کا گناہ ڈھانپ لیتا۔ تب بڑے غم خوار ہمدرد اور ایثار پسند انسان کی مانند میں نے خود کو پیش کر دیا۔ بیچارے کرمی صاحب کو یقین تھا کہ اب نہ تو کوئی اور نہ ہی تم عافیہ کو شریک زندگی بنانا پسند کرو گے لہٰذا جلد سے جلد عافیہ کا نکاح مجھ سے کر دیا گیا۔ میری دیرینہ آرزو پوری ہو چکی تھی، شاید مجھے اپنی شیطانی خواہش کی تکمیل میں شادیٔ مرگ ہو جاتا مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اب قدرت مجھ سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ کب تک قدرت میرا ساتھ دیئے جاتی۔! کرمی صاحب یہ صدمہ نہ سہار سکے۔ اور دوسرے ہی روز ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر یہ سانحہ منجانب اللہ رونما نہ ہوتا تو خدا جانے میری بوالہوسی کیا رنگ اختیار کرتی۔ اور، دوسرا سانحہ۔ یہ ہوا کہ۔ تیسرے روز میں ایک ناگہانی حادثے سے دوچار ہو گیا۔

میں ہائی کورٹ کے زینے طے کرتا ہوا اوپر سے نیچے گرا۔ اور نجانے کہاں چوٹ آئی کہ ڈاکٹر صاحبان نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا کہ اب میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا۔! اس خبر نے جہاں مجھے ایک بڑے غم اور صدمہ سے دوچار کیا تھا وہیں میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوا تھا کہ اب میری سزاؤں کا آغاز ہو گیا ہے ؟!۔

اور پھر مجھ پر سزاؤں کے تازیانے برستے رہے! میں نے جھوٹ پر جھوٹ بولے! غلطیوں پر غلطیاں کیں۔ آج یہ انجام ہے کہ میں اپنے اعمالِ بد کے پہاڑ تلے دبا ہوں! میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ تم ناکام اور مایوس محبت اپنے مستقبل کو ٹھکرا کر واپس آئے۔ میرے در پر ہاتھ پھیلایا۔ میں نے تم سے بھی یہی کہہ دیا کہ۔ میں عافیہ کو نہیں جانتا۔ وہ کہاں گئی ؟۔ اف۔ اف۔ خدا معاف کرے مجھے! مجھے احساس تھا کہ تمہارا مستقبل تباہ ہو چکا تھا۔ اور اب میں چاہتا تھا کہ اسے سنوار دوں مگر وقت گزر چکا تھا اور مجھ میں اعترافِ گناہ کا یارا نہیں تھا۔! پھر پچھتاؤں اور ندامتوں نے مجھ پر حملے کرنے شروع کر دیئے تب میں نے سوچا کہ میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ دانش۔ تب مجھے پتہ چلا کہ پایا تو میں نے کچھ بھی نہیں۔ اور کھویا بہت کچھ۔ اس کے سوا مجھے پتہ چلا کہ قدرت نے گناہوں کی پاداش میں میری اپنی اولاد کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔ میں نے اولاد بھی گنوا دی تھی۔!

اور آج۔ میں ایک راستے پر کھڑا ہوں۔ جہاں سے سیکڑوں اور راستے پھوٹتے ہیں لیکن منزل تک کوئی نہیں پہنچتا۔ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میرا ہر عمل۔ جو میں شروع سے اب تک برابر کرتا آیا ہوں اگر پتھر کی لکیر نہیں تھا تو پھر نقشِ بر آب تھا۔ کیا ملا مجھے ؟۔

روح کی ندامت۔

کردار کی شکست و ریخت۔

اپنی نگاہوں میں آپ گرنے کا روح فرسا احساس۔

پھر میری روح کو پچھتاوؤں کے ناگ ڈسنے لگے۔ اور تب میں نے

پختہ ارادہ کر لیا کہ میں! اپنی اعمال کو اپنے ندامتوں اور تم سب کی معافیوں سے دھونے کی کوشش کروں گا۔!

میں نے ارادہ کر لیا کہ مجھے اب زندہ رہنا نہیں ہے. خدا نے میری مدد کی۔ وہ بیماری میری نجات بن کر مجھ پر نازل ہوئی جس نے مجھے یکبارگی بہت ہلکا پھلکا کر دیا. تم مجھ سے علاج معالجہ پر اصرار کرتے رہے لیکن میں تو یہ چاہتا تھا کہ یہ لعنت آفریں زندگی جس قدر جلد ختم ہو جائے اسی قدر اچھا ہے! اور اب میری یہ تمنا بھی پوری ہوتی نظر آرہی ہے. خدا کرے کہ اس کا بلاوا جلد مجھ تک پہنچے۔!

دانش! یہ میری آخری تمنا ہے۔ وصیّت ہے. کہ تم عافیہ سے شادی کر لینا۔ وہ اسی طرح پاک و مطہّر ہے جس طرح کہ اپنے باپ کے گھر میں تھی۔ اس کا دامن ہر طرح سے اس قابل ہے کہ اس پر فرشتے اور حوریں سجدہ کریں۔

کاش! مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ میں عافیہ سے بھی معافی مانگ سکتا۔!

اور سنو! وہ کوٹھی جس میں فاخرہ اور اس کا شوہر مقیم ہیں۔ اس کے علاوہ میرا جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب کچھ تمہارا اور تمہاری بیوی عافیہ کا ہے۔ بیگم کریمی اور حمزہ پر جو پہاڑ صرف میری وجہ سے ٹوٹا ہے۔ میں اس کی تلافی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اسی خط کے ساتھ جو دستاویز منسلک ہے وہ محترمہ بہن بیگم کریمی کو دے دینا۔!

خدا تمہیں اور عافیہ کو خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے۔!

اپنے گناہ گار کو معاف کر دینا۔

دعا کرنا کہ خداوند کریم بھی مجھے معاف کر دے!!

عبادالرحمٰن!

یہ خط صرف دانش نے پڑھا تھا۔! اور کسی کو۔ حتیٰ کہ۔ عافیہ کو بھی بتائے بغیر نذرِ آتش کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بیرسٹر صاحب کسی کی نظروں میں بُرے ٹھہریں۔۔!

بیرسٹر صاحب کی وصیت کے مطابق دانش اور عافیہ ایک دوسرے کے

ساتھی بن گئے۔!

اور جب پہلی بار بحیثیت میاں بیوی دانش اور عافیہ بیرسٹر صاحب کی ابدی خواب گاہ پر گئے!۔ تب وہ سوچ رہے تھے کہ یہ قبر کسی گناہ گار کی نہیں۔ ایک اچھے انسان کی تھی۔ جس نے توبہ کی اور شاید نجات کا راستہ پا لیا۔

تبھی تو، جب دانش اور عافیہ نے فاتحہ کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے تو ان کی نگاہوں کے سامنے بیرسٹر صاحب کا چہرہ آ گیا۔ اپنی مہربان مسکراہٹ کے ساتھ !!!۔

ختم شد۔! طبع زاد۔ غیر مطبوعہ۔!

عفّت موہانی۔!

نسیم انہونوی کی ادارت میں شائع ہونے والا

اپنی نوعیت کے اعتبار سے

اردو کا سب سے قدیم رسالہ

حریم لکھنؤ

صحیح معنوں میں مشرقی خواتین کی رہنمائی کر رہا ہے اسمیں بہترین اصلاحی معاشرتی افسانے، مضامین اور دوسری گھریلو باتیں شائع ہوتی ہیں

ساتھ ہی

ہر سال جنوری کا پرچہ ایک مکمل ناول کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے اور ایک قسط وار ناول ہر ماہ پیش کیا جاتا ہے۔ سالنامہ میں رعایتی اعلان کے تحت حریم کے خریدار اپنی پسندیدہ کتابیں خرید سکتے ہیں۔